مسلم یونیورسٹی کا سہ ماہی علمی اور ادبی رسالہ

فکر و نظر

(غالب نمبر)

شائع کردہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

فکر و نظر

غالب نمبر

سنہ ۱۹۶۹ء

جلد ۹ شمارہ ۵-۲

مجلس ادارت

جلد (۹) شمارہ مسلسل نمبر ۳۴ شمارہ (۲)
قیمت سالانہ دس روپے (عـہ) (علاوہ محصول ڈاک)
قیمت فی پرچہ ڈھائی روپے (عـ۸ـر) (علاوہ محصول ڈاک)

فکر و نظر

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ

فکر و نظر کے سلسلے کی ساری خط و کتابت قاضی شریف الحسن بلگرامی
دفتر پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پتے سے کی جائے

مطبوعہ لیتھو کلر پرنٹرس اچل تال علی گڑھ ـ ٹیلیفون نمبر ۸۵

اِداریہ

پندرہ فروری ۱۹۶۹ء کو غالبؔ کے انتقال کو پورے سو سال ہو گئے۔ جب غالبؔ اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے اس وقت بھی ان کے قدرداں اور مداح سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، ان کی اردو اور فارسی کی قریب قریب سبھی تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ ان کا متداول اردو دیوان پانچ دفعہ چھپ چکا تھا۔ سرسید نے آثار الصنادید میں ان کی عظمت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اس وقت تک اردو کے مقابلے میں فارسی کے زیادہ بڑے شاعر اور انشا پرداز سمجھے جاتے تھے اور ذوقؔ کو ان پر عام طور سے ترجیح دی جاتی تھی۔ سرسید کے بعد سب سے پہلے آزادؔ نے آب حیات میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا اگرچہ ذوقؔ کو بڑھانے پر زیادہ زور صرف کیا۔ پھر حالیؔ نے یادگار غالب کے ذریعہ سے غالبؔ کی شخصیت اور ان کی اردو اور فارسی نظم و نثر کا تعارف کرایا غالبؔ کی عام مقبولیت دراصل یادگار غالب سے شروع ہوتی ہے۔ گو حالیؔ نے غالبؔ کے سوانح بیان کرنے میں نہ تفصیل سے کام لیا نہ معروضیت سے، مگر انھوں نے غالبؔ کی ایک دلکش اور شوخ تصویر ضرور پیش کر دی۔ پھر انھوں نے غالبؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات کی طرف نہ صرف اشارے کیے بلکہ غالبؔ کے بہت سے اشعار کی اچھی خاصی شرح بھی بیان کر دی۔ انھوں نے غالبؔ کے اردو خطوط کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور ان کی فارسی شاعری کا فارسی کے بعض مسلم الثبوت شعرا کے کلام سے موازنہ بھی کیا۔ انھوں نے درست کہا ہے "خسروؔ اور فیضیؔ کے بعد غالبؔ جیسا جامع الحیثیات آدمی ہندوستان کی سرزمین سے نہیں اٹھا۔"

حالیؔ کی دوربینی کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ یادگار غالب کی اشاعت کے بعد سے غالبؔ کی مقبولیت برابر بڑھتی جاتی ہے۔ دراصل غالبؔ اپنے زمانے سے آگے دیکھتے تھے۔ وہ واقعی "عندلیب گلشن نا آفریدہ" تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بلندی کا احساس ان کے زمانے میں کچھ ہی لوگوں کو ہوا، عام نظریں ذوقؔ کی ہموار اور شائستہ روش پر جمی رہیں۔ جب مغرب کے اثر سے ادب کی اپنی اہمیت کا احساس بڑھا تو غالبؔ کے فکر و فن کا عرفان بھی بڑھنے لگا۔ ابوالکلام آزادؔ نے الہلال میں غالبؔ کا کچھ غیر مطبوعہ کلام پہلی دفعہ شائع کیا۔ بجنوری نے محاسن کلام غالب لکھ کر غالبؔ کو آفاقی شاعری کے معیار سے پرکھا۔ ان کی تنقید میں اگرچہ پرستش زیادہ ہے

پرکھ کم، مگر اپنی ذہنی ہمدردی اور گہری فنی بصیرت کی وجہ سے وہ بہت سی مکتبی تنقیدوں سے زیادہ قابل قدر ہے۔
نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے غالب کے ابتدائی کلام کی اہمیت پر بھی نظریں پڑنے لگیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد
ہی ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کے کلام کو تاریخی ترتیب سے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کا یہ کام تو پورا نہ ہوسکا مگر
ان کی کتاب 'غالب' سے غالب پرستوں میں خاصی ہلچل مچ گئی۔ دراصل لطیف نے شروع میں غالب کے پرکھنے
کے جو اصول بیان کیے تھے، خود ان پر عمل نہ کرسکے اور چونکہ انھوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا تھا مگر اردو ادب
پر ان کی نظر گہری نہ تھی اس لیے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ غالب نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سایہ میں ایک منتشر
زندگی بسر کی اور ہمارے لیے ایسی شاعری چھوڑی جو روحانی ہم آہنگی سے قطعاً معرا ہے۔" ظاہر ہے کہ غالب سے
یہ توقع کرنا کہ وہ مشرقی فضا میں سانس لیتے ہوئے، فارم کے مغربی تصور تک پہنچ جاتا، قرینِ انصاف نہیں ہے
مگر لطیف کی کتاب کا ردعمل یہ ہوا کہ غالب کی زندگی اور شاعری کے ہر پہلو کا جائزہ لینے کی کوششیں اور تیز ہوگئیں
مہیش پرشاد نے غالب کے خطوط کو ایڈٹ کرکے ہندوستانی اکیڈمی سے شائع کیا۔ اس کتاب پر ڈاکٹر عبدالستار
صدیقی نے نظرثانی کی تھی۔ عرشی نے مکاتیب غالب کے ذریعہ سے رام پور کے نوابوں کے نام غالب کے اہم خطوط
پہلی دفعہ یکجا کرکے شائع کیے اور ان پر ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا۔ انھوں نے اس کے علاوہ غالب کا اپنا اردو اور فارسی
شاعری کا وہ انتخاب بھی شائع کیا جو نواب یوسف علی خاں کے لیے کیا گیا تھا۔ مالک رام نے ذکر غالب کے ذریعہ سے
غالب کی زندگی کے تمام اہم واقعات کی نشاندہی کی اور بہت سا نیا مواد پیش کیا۔ اکرام نے 'غالب نامہ' لکھ کر لطیف
کے نقطۂ نظر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا اور غالب کے ذہنی ارتقا
اور ان کی عظمت کے بہت سے گوشے واضح کیے۔ غلام رسول مہر نے غالب کی تصانیف سے ان کے سوانح مرتب
کیے اور اس کے دوسرے ایڈیشن پر مولانا ابوالکلام آزاد نے بڑے مفید حواشی لکھے۔ ادھر حسرت، نظامی بدایونی
بے خود موہانی، طباطبائی اور آسی کی شرحیں غالب کی تفہیم میں مدد دے چکی تھیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے
طلبا کے لیے غالب کی اردو شاعری اور ان کے خطوط کے بہت سے انتخابات سامنے آچکے تھے کہ علی گڑھ میگزین
کے غالب نمبر میں مختارالدین آرزو نے بہت سا نیا مواد جمع کردیا جو تحقیق و تنقید دونوں کے لحاظ سے قابل قدر تھا۔
بعد میں انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے نظرثانی اور اضافے کے بعد یہ مواد احوال غالب اور نقد غالب کے نام
سے دو علحدہ کتابوں میں سامنے آیا۔ اکرام نے غالب نامہ میں اضافہ کرکے دو جلدوں میں آثار غالب اور ارمغان غالب
کے نام سے پہلے ہی شائع کردیا تھا۔ بعد میں انھوں نے حکیم فرزانہ کے نام سے آثار غالب کے مواد کو نئی صورت
میں اضافے کے ساتھ پیش کیا۔ ۱۹۵۸ء میں عرشی صاحب نے برسوں کی تحقیق کے بعد غالب کا سارا اردو کلام ایک
جامع مقدمے کے ساتھ نسخۂ عرشی کے نام سے تیار کیا جسے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ غلام رسول مہر کے مقدمے

کے ساتھ شیخ مبارک علی نے لاہور سے غالب کے فارسی کلام کا ایک صاف ستھرا اڈیشن شائع کیا۔ امیر حسن نورانی نے لکھنؤ سے ایک دوسرا اڈیشن شائع کیا۔ غالب کے خطوط کا ہندی اڈیشن ہندوستانی اکیڈمی سے شائع ہوا۔ سردار جعفری نے ایک خاص اڈیشن اردو اور ہندی رسم خط میں نکالا جس پر ایک قابل قدر مقدمہ بھی ہے۔ مرقع چغتائی کے نام سے دیوان غالب کا مصور اڈیشن اقبال کے مقدمہ کے ساتھ چغتائی پہلے شائع کر چکے تھے دوبارہ نقش چغتائی کے نام سے ایک سستا اڈیشن بھی انھوں نے بعد میں شائع کیا۔ مالک رام نے تلامذۂ غالب لکھی اور اس کے علاوہ غالب کے متداول کلام کے ساتھ نسخۂ حمیدیہ کا ایک انتخاب بھی شامل کر کے آزاد کتاب گھر دہلی سے شائع کیا۔ ہندی رسم خط میں غالب کے کلام کے درجنوں سستے اڈیشن شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ بکے۔ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی غالب پر مضامین اور غالب کے اشعار کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ پنڈت جیالال کول نے (INTERPRETATIONS OF GHALIB) کے نام سے غالب کے کچھ منتخب اشعار کا انگریزی ترجمہ شائع کیا مگر اصل خیال کو واضح کرنے کے لیے جا بجا اُسے ترجمہ کے بجائے تفسیر بنا دیا۔ یہ غالب پر کام کی خاصی سرسری تصویر ہے اور اس میں یقیناً بہت سے اہم نام چھوٹ گئے ہوں گے، مگر اس کا مقصد صرف ایک خاکہ پیش کرنا ہے۔ مکمل جائزہ کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھا ہے۔

جب غالب کی صد سالہ برسی نزدیک آنے لگی تو سب سے پہلے انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۶۴ء میں ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی کہ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی مناسب شان و شوکت سے منائی جائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے، صدارت کی درخواست کی گئی اور انھیں کے مشورے سے جناب احمد محی الدین کو اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ یہ طے پایا کہ مرکزی کمیٹی تمام اردو کے علمی اداروں، یونیورسٹیوں اور ماہرین کے تعاون سے غالب کی تمام تصانیف کے اچھے اڈیشن شائع کرانے کی سبیل کرے اور غالب کے شایانِ شان ان کی یادگار قائم کرے اور اس سلسلے میں حکومت ہند سے مناسب امداد حاصل کرنے کے لیے کوششیں کرے۔ مگر بد قسمتی سے احمد محی الدین کا کچھ عرصے کے بعد انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ جناب فخر الدین علی احمد کمیٹی کے سکریٹری نامزد کیے گئے۔ انھوں نے پچھلی کمیٹی کو خارج کر کے ایک نئی کمیٹی بنائی جس نے غالب میموریل ہال کے لیے حکومت سے زمین اور ایک معقول عطیہ حاصل کیا اور اس کے علاوہ دہلی میں اعلیٰ پیمانے پر ۱۵ر فروری سے ۲۲ر فروری تک تقریبات کا انتظام کیا۔ مگر افسوس ہے کہ کمیٹی دوسرے علمی اداروں کا تعاون حاصل کر کے غالب کی تصانیف کے اچھے اڈیشن شائع نہ کرا سکی۔ بہر حال یہ کام ضروری ہے اور اب بھی ہو سکتا ہے۔ ۲۲ر فروری ۱۹۶۹ء کو حکیم عبد الحمید کی ان تھک کوشش سے جو علمی، تہذیبی اور ادبی دنیا میں اپنی غیر معمولی عملی صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور ہو گئے ہیں۔ ایک غالب اکیڈمی کی عمارت کا ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے

افتتاح کیا۔ اس اکیڈمی نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور غالب کی تصانیف اور خطوط خاصی تعداد میں جمع کرنے کے علاوہ اردو کا ایک اچھا کتب خانہ اور غالب کے عہد کے آثار بھی جمع کر لیے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے غالب پر کئی کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ متاع غالب کے نام سے غالب کی فارسی غزلوں کا انتخاب اور علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ غالب کے اردو خطوط کا انتخاب اور اس کا ہندی ایڈیشن بھی جلد شائع ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے فکر، غالب کے فن، غالب کی اردو نثر اور غالب کے اثرات پر کتابچے بھی شائع ہوں گے اور غالب کی کچھ ایسی تحریریں بھی دوبارہ منظر عام پر لائی جائیں گی جو اب قریب قریب نایاب ہیں۔ رسالہ فکر و نظر کا غالب نمبر آپ کے سامنے ہے۔ دہلی میں تقریبات کے علاوہ علی گڑھ، بمبئی، حیدر آباد، لکھنو، الہ آباد میں غالب پر سیمینار اور لیکچر ہوئے۔ انجمن ترقی اردو ہند نسخہ عرشی کا نیا ایڈیشن شائع کر رہی ہے۔ اس کا متن چھپ چکا ہے مگر عرشی صاحب کی علالت کی وجہ سے مقدمہ ابھی تک نہیں چھپ سکا۔ قاضی عبدالودود نے قاطع برہان کو دوبارہ ایڈٹ کیا ہے۔ مالک رام نے دستنبو کو مالک رام نے متداول دیوان غالب کا ایک خاص ایڈیشن غالب سینٹنری کمیٹی کی طرف سے شائع کیا ہے۔ غالب اکیڈمی کی طرف سے ڈاکٹر یوسف حسین کی کتاب غالب اور آہنگ غالب شائع ہوئی ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی نے انگریزی میں مجیب صاحب کی ایک کتاب غالب پر شائع کی ہے جس میں غالب کے منتخب اشعار کے تراجم بھی شامل ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے مجیب صاحب کا غالب کے اردو کلام کا انتخاب بھی شائع کیا ہے جس پر ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے۔ انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نسخہ حمیدیہ سے خاصی تعداد میں اشعار لیے گئے ہیں اور یہ اچھے اشعار ہیں جن پر لوگوں کی پہلے توجہ نہیں تھی۔ عتیق صدیقی نے غالب اور ابوالکلام کے عنوان سے مولانا کے غالب پر سارے حواشی اور نوٹ یک جا کر دیے ہیں۔ پرتھوی چندر نے حق جاگیر غالب کے عنوان سے غالب کی اپنی پنشن کے سلسلے کی عرضداشتوں کا عکس اور اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ عبدالقوی دسنوی نے غالبیات کے عنوان سے غالب پر کتابوں اور مضامین کی نشاندہی کی ہے۔ شفیع الدین نیر نے بچوں کے لیے غالب کی کہانی لکھی ہے۔ پبلی کیشنز ڈویژن نے گنجینۂ غالب کے عنوان سے آج کل دہلی میں شائع شدہ غالب پر چودہ مضامین شائع کیے ہیں۔ پریم پال اشک نے روزمرہ و محاورۂ غالب کے عنوان سے غالب کے کلام میں ان دونوں کی نشاندہی کی ہے۔ غالب پر چار ڈرامے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ایک نذیر محمد خاں کا، دوسرا منجو قمر اللٰہی کا، تیسرا ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا دودِ چراغ محفل کے نام سے اور چوتھا ابرار الرحمٰن قدوائی کا تصویر خیال کے عنوان سے۔

انگریزی میں جو کتابیں نکلی ہیں ان میں احمد علی کی منتخب نظمیں (SELECTED POEMS) مجیب کی

(باقی صفحہ ۱۲۲ پر ملاحظہ فرمایئے)

معز علی بیگ

غالب اپنے نفسیاتی پس منظر میں

[کسی ایسے انسان کی شخصیت کے نفسیاتی پس منظر کو جاننا جو مر چکا ہو صرف اسی طرح ممکن ہے کہ یا تو اس کے ماں باپ اور قریبی اعزا سے اس کے فکر، جذبات و احساسات۔ مزاج اور افتادِ طبع کی بابت معلومات کی جائیں یا پھر ان باتوں کے ذریعہ سے جو وہ اپنی بابت ضبط تحریر میں لا چکا ہو۔ مرزا غالب کے بارے میں، جن کے انتقال کو اب سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے، ان باتوں کے جاننے کا ذریعہ یا تو ان کا کلام اور دیگر تحریریں، یا ان کی زندگی کے وہ حالات ہیں جو اور لوگوں نے لکھے ہیں۔ ہمارے لیے یہ سب ذرائع کارآمد ہو سکتے ہیں اور اس معاملہ میں ان کا کلام خصوصیت سے ہمیں اس وقت مدد دے سکتا ہے جب ہم اسے ان کی زندگی کے حالات کو سامنے رکھ کر سمجھنے کی کوشش کریں۔ مرزا صاحب کا کلام صرف ان کی شاعرانہ عظمت ہی کا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا بھی آئینہ دار ہے۔ یہ کلام جن احساسات کی غمازی کرتا ہے ان میں ڈوب کر ہم ایک حد تک یہ جان سکیں گے کہ اس کا کہنے والا کیا تھا، اس کے اندرون کی دنیا کیسی تھی اور وہ اپنے آپ کو اور اپنے چاروں طرف کے ماحول کو کن آنکھوں سے دیکھتا تھا اور کیونکر اسے محسوس کرتا تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا اور اس پر کیا گزر رہی تھی۔

چنانچہ ذیل کے مضمون میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس طرح اس عظیم المرتبت شاعر کے ذہن و فکر، اس کے احساسات، افتادِ طبع اور اس کی شخصیت کے بعض عمیق پہلوؤں کو سمجھیں جسے دنیا مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نام سے جانتی ہے۔ اس کے لیے ہمارے پیش نظر خصوصیت سے ان کے بچپن اور اوائل عمر کا ماحول اور اس کے حالات ہیں جہاں سے ان کی شخصیت کا آغاز ہوتا ہے۔

مرزا غالب کے بچپن اور عنفوانِ شباب کے ماحول اور بعد کے ماحول میں ایک ایسا تفاوت ہے جس نے ہمارے خیال میں ان کی شخصیت پر ایک غیر معمولی اثر ڈالا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول

کے تصورات کو لے کر انھوں نے اپنے اندرون میں ایک ایسی دنیا بنالی جو آئندہ چل کر ان کے لیے ایک نفسیاتی پناہ گاہ ثابت ہوئی جس میں کبھی کبھی وہ تیرگیٔ غم و آلام سے گھبرا کر پناہ لیتے تھے ممکن ہے کہ اس اندرون کی دنیا کو دیکھنے سے ان کی شخصیت کے تخلیقی پہلو پر کچھ روشنی پڑے اور ہم غالب کو بہ حیثیت شاعر اور انسان کچھ قریب آکر سمجھ سکیں۔

اس مضمون میں ہم نے کم و بیش تمام تر ان کے اردو کلام کو سامنے رکھا ہے جو وہ پچیس سال کی عمر تک تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ اس عرصے میں جو تجربات ان کو ہوئے وہ ان کی شخصیت کے لیے آخری اور فیصلہ کن معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ بعد کی زندگی میں مرزا صاحب نفسیاتی اعتبار سے زیادہ نہیں بدلے۔ ہمارا خیال ہے کہ بعد کے تجربات ان کے احساسات اور انداز فکر کی توثیق ہی کرتے چلے گئے۔ یہاں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شادی (جو صرف تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی) ان کی شخصیت کے لیے ایک گتھی پیدا کر گئی۔ ہمارا قیاس ہے کہ عنفوان شباب کی بہت سی امنگوں، ولولوں اور رومانی خواہشات کے لیے اس شادی کا ہونا کسی عذاب سے کم نہ تھا مگر اردو ادب کے لیے شاید یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ ان ہی امنگوں کی شادابی اور شگفتگی سے مرزا صاحب نے اپنے اندرون کی دنیا میں وہ حُسن پیدا کر لیا جو ان کی شب و روز کی زندگی میں بالکل مفقود تھا۔ غالب نے شعر کے پیکر میں جو کچھ ہم کو دیا ہے اسے نفسیاتی طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں ایک طرف تو ان کو اس عالم حقیقت میں رکھ کر دیکھنا ہوگا جس میں ان کے لیے "رفتار عمر قطع رہ اضطراب" تھی اور دوسری طرف اس اندرون کی دنیا میں جس کی پہنائیوں میں "دلِ گم گشتہ" کی تلاش اور کسی امید موہوم کی گذرگاہ کا خواب آفریں تصور ان کو اس عالم حقیقت سے ایک عارضی مصالحت کیے رہنے پر راضی رکھتا تھا۔]

مرزا اسد اللہ بیگ ایک ترک زادہ مغل تھے اور وہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کر سکتے تھے کہ ان کا سلسلۂ نسب ایرانی فرمانراؤں سے ملتا ہے۔ ان کو صرف یہ احساس ہی نہیں تھا کہ "در نسب فرہ مندیم" بلکہ وہ اس آن بان، اس "شوکت دارائی" اور "فر فریدوں" کو اپنی اس زندگی میں نباہنا بھی چاہتے تھے جسے حقیقت فی الواقع کہیں سے کہیں لے آئی تھی۔ مگر اس کہیں سے کہیں" کے درمیان میں ایک بڑا طویل فاصلہ ہے جسے طے کرنے کے لیے ہمیں مرزا اسد اللہ بیگ کی پُر از آلام زندگی کے نشیب و فراز سے گذرنا ہوگا۔

مرزا صاحب کے بچپن کے دن ایک ایسے ماحول میں گذرے جہاں آرام اور آسائشوں کی فراوانی

نے ان کو سرپرستیوں کی محرومی اور ان کی یتیمی کا احساس پوری طرح کبھی نہ ہونے دیا۔ باپ اور چچا کے انتقال کے بعد ایک مدت تک یہ صورت حال جاری رہی۔ ان کے نانا نے اپنی شفقت سے مجبور ہو کر اور ان نے غالباً اپنی لاپرواہیوں کی وجہ سے مرزا صاحب کو ان باتوں کے کرنے سے کبھی نہیں روکا جن سے ان کے باپ یا چچا یقیناً ان کو روکتے۔ یہیں سے شاید ان کے مزاج میں آزاد منشی اور عام ذمہ داریوں کو ایک بارگراں محسوس کرنے کی وہ عادت پڑی جو مرتے دم تک ان کو یہ احساس دلاتی رہی کہ ان کی زندگی ایسے شکنجوں میں جکڑی ہوئی ہے جن سے صرف موت ہی انھیں رہا کر سکتی ہے۔ چنانچہ علاوہ اور باتوں کے ایک یہ بات بھی تھی جس کی وجہ سے وہ واقعی "عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ"۔ مگر ایسا کیوں ہوا کہ ان آسائشوں میں بچپن گذارنے کے بعد بھی مرزا صاحب کے ذہن پر نہ صرف موت کا تصور چھایا رہا[1] بلکہ ان کے دل میں موت کی آرزو تا حیات گھر کیے رہی اور انھیں بے چین کرتی رہی؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب میں نفسیات کی روشنی میں ڈھونڈنے سے نظر آئے گا کہ وہ مرزا صاحب کی شخصیت کی پرچھائیوں کے ساتھ ساتھ کبھی صاف اور کبھی دھندلا ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اب ہم انھیں پرچھائیوں کے ساتھ اس کے صاف اور دھندلے نقوش کو دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ مرزا صاحب نے قدرتاً ایک ایسا تیز اور دراک ذہن پایا تھا جو حادثات، آلام و مصائب، محرومیوں، اور نفسیاتی جھٹکوں کو بآسانی جھیل سکتا تھا۔ ایک معمولی ذہن رکھنے والا انسان صدمات کے بوجھ سے عموماً یا تو خودکشی اور فرار کی طرف مائل ہوتا ہے یا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ کا دیوانہ ہو جانا ہمارے اس قیاس کو تقویت پہنچاتا ہے کہ ایک طرف تو ان کے خانگی ماحول میں وہ اثرات موجود تھے جو ذہنی صحت کے لیے برباد کن ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان کو ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا جو اوسط درجے کے ذہن رکھنے والے

---

[1] ہمارا خیال ہے کہ مرزا صاحب کے کلام اور ان کی شخصیت کو بخوبی سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ موت کی اس آرزو کا سراغ لگایا جائے تو ان کے یہاں نہ صرف بنیادی اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس کا تعلق ان کی شخصیت کے بعض عمیق ترین پہلوؤں سے ہے۔ موت کا تصور۔ اس کی آرزو، اس کا انتظار یہ سب وہ باتیں ہیں جن کو ماننے کے لیے ان کے بچپن کے حالات کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ مرزا صاحب کی زندگی کے ساتھ ساتھ یہ خواہش مرگ اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ ان کی وفات سے چند سال قبل یہ ایک ایسی شکل اختیار کر گئی جس کو صحت مند کہنا ہی مشکل ہے۔

اس اعتبار سے اگر غالب کا موازنہ انگلستان کے رومانوی شاعر شیلے (SHELLY) سے کیا جائے تو نظر آئے گا کہ دونوں کی نفسیات میں صرف اتنا فرق ہے کہ غالب بے چینی سے موت کا انتظار کرتے رہے اور شیلے بے چین ہو کر اس کی جستجو کرتا رہا یعنی یہ موت کی آمد آمد کے منتظر رہے اور وہ موت کے پیچھے دوڑتا رہا۔

انسان کی شخصیت کے توازن کو ختم کر دیتے ہیں۔ مگر یہی باتیں ایک درّاک ذہن رکھنے والے انسان کی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لے آتی ہیں اور وہ ان تجربات کی اس طرح پر توجیہ کر لیتا ہے کہ یہ اس کے ذہنی توازن کو ختم نہیں کر پاتے۔ چنانچہ مرزا صاحب کی درّاکی اور تخلیقی قوتوں نے آڑے آکر ان کو اس المناک انجام سے بچا لیا جس سے مرزا یوسف کو دوچار ہونا پڑا۔ مرزا صاحب کی تخلیقی قوتیں بچپن ہی سے بیدار ہو چکی تھیں اور جیسا کہ خود ان ہی کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے وہ دس گیارہ سال کی عمر کے لگ بھگ شعر کہنے لگے تھے اس دوران میں باپ اور چچا کی موت کے صدمات صرف ماں کی بے پناہ شفقت ہی سے کم ہو سکتے تھے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً وہ اس سے بہت حد تک محروم رہے کچھ بعید نہیں ہے کہ ان کی ماں کی محبت میں احساس فرض اور احساس ذمہ داری کو زیادہ دخل رہا ہو اور اس میں شفقت مادری کا وہ والہانہ انداز نہ رہا ہو جو بچے کے جذبات کی تسکین کے لیے قطعاً ناگزیر ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ماں کے بقید حیات ہوتے ہوئے مرزا صاحب کو اپنی ایک پھوپی سے اس قدر لگاؤ کیوں تھا کہ صرف اس پھوپی کی محبت ہی ایک طویل عرصہ تک ان کے دیگر بزرگوں اور سرپرستوں کی موت کی تلافی کرتی رہی۔ جو خط انھوں نے منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے اس سے غیر مشتبہ طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ متوسط عمر تک وہ صرف ایک پھوپی کی محبت کا سہارا لے کر اپنے متعدد سرپرستوں سے محرومی کی تلافی کرتے رہے چنانچہ ان کی موت پر وہ لکھتے ہیں:۔

"بھائی صاحب میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی آپ کو معلوم ہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے یہ جانا کہ یہ نو آدمی آج مر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون[۵]"

یہ خط ۱۸۵۳ء کا لکھا ہوا ہے جبکہ ان کی عمر ۵۶ سال کی تھی۔ اس عمر میں ان کے وہ احساسات جو اس تحریر سے مترشح ہوتے ہیں صاف طور پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پھوپی سے یہ جذباتی وابستگی بچپن اور بعد کی عمر میں ان کی شخصیت کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی۔ یہاں لفظ "ماں" اور "بیٹے" کا استعمال محض رسمی نہیں ہے بلکہ پھوپی کی شخصیت مرزا صاحب کے لیے نفسیاتی اعتبار سے ماں کی شخصیت کا

---

[۵] خطوط غالب، مرتبہ مالک رام، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۳۵-۱۳۶۔

نعم البدل تھی۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب ماں میں شفقت مادری کا فقدان اس درجہ ہو کہ وہ بچے کے اندر ایک احساس محرومی پیدا کر دے۔ مرزا یوسف بیگ کا مرض دیوانگی میں مبتلا ہونا ہمیں مزید اس بات کے سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ان کی والدہ کا رویہ اپنے دو بیٹوں کے ساتھ کیسا تھا؟ ہمارا خیال ہے کہ بچپن ہی سے مرزا صاحب ایک احساس محرومی لے کر اٹھے اور ان کو وہ جذباتی آسودگی نصیب ہی نہ ہوئی جو صرف ماں اور باپ ہی کی والہانہ محبت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ بچپن میں اس کا ردعمل غالباً اس طرح ہوا کہ ایک طرف تو انھوں نے پھوپی کی محبت کو ایک غیر معمولی جذباتی سہارا بنا لیا اور دوسری طرف بچپن کی دلچسپیوں میں خود کو اتنا محو اور گم کر دیا کہ وہ نہ صرف ان کے صدمات کا ایک مستقل ازالہ بن گئیں بلکہ ان کے لیے جذباتی آسودگی کا ایک ایسا ذریعہ بھی ثابت ہوئیں جو حقیقت میں ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ان جذبات میں تخیل کی آمیزش سے انھوں نے اپنے اندرون میں وہ دنیا بنا لی جو ان کی ذہنی آسودگی کا واحد ذریعہ تھی اور جو ساتھ ہی ساتھ ایک تلخ اور ناقابل برداشت حقیقت کے بالمقابل ایک نفسیاتی حصار کا کام کرتی تھی۔ البتہ اگر کوئی چیز اس حصار کے لیے خطرہ تھی تو وہ موت کا تصور تھا۔ پے در پے اموات نے ان کے ذہن پر موت کی ہولناکی اور قطعیت کا تصور اس طرح بٹھا دیا کہ وہ ساری عمر سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہا۔ آئندہ چل کر انھوں نے اسی تصور کو اپنی فکر کا جز بنا لیا اور اس پر ایک سیدھے سادے فلسفے کی عمارت قائم کر لی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ عمر اور حالات کے ساتھ موت کا تصور بعض ایسے تصورات سے وابستہ ہو گیا جو بجائے خود بڑے ہی دلفریب اور حسین تھے اور جن کا تعلق بعض کھوئی ہوئی آرزوؤں سے تھا چنانچہ آہستہ آہستہ اس کے اندر سے ہولناکی کا پہلو ختم ہو گیا اور یہ تصور بجائے خود ایک آرزو بن گیا۔ بالفاظ دیگر وہ ایک بے چین کرنے والی خواہش مرگ میں بدل گیا۔ اس طرح ان کے اندرون کی دنیا بالآخر اس خطرے سے بھی محفوظ ہو گئی۔ آگے چل کر ہم اس بات کی وضاحت کریں گے کہ کس طرح موت کے تصور کو انھوں نے اپنے اندرون کی دنیا سے ہم آہنگ بنا لیا تھا۔

بچپن کی بے فکری اور محویت کو یکایک جس چیز نے توڑا وہ ان کی شادی تھی جو تیرہ سال کی عمر میں ہو گئی بلکہ کر دی گئی چنانچہ ان کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ وہ پابہ زنجیر ہو گئے اور اس کے بعد ایک قلیل مدت ہی میں ان کو آگرہ بھی چھوڑنا پڑا۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔"[۱]

---

[۱] بحوالہ ذکر غالب، از مالک رام۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، دہلی ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۳

جو احساس اس تحریر سے مترشح ہوتا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ شادی ایک مجبوری کی شادی تھی اور شاید اس لیے کی گئی تھی کہ مرزا صاحب کی توجہ کو ان دلچسپیوں سے ہٹایا جائے جس میں وہ اس وقت تک محو تھے اور اس ماحول سے دور کر دیا جائے جہاں لہو و لعب میں پڑ جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ مگر مرزا صاحب نے جس طرح اپنی زندگی کے بارہ تیرہ سال گزارے تھے اور اس عمر میں ان کا جو مزاج بن چکا تھا اس کے اعتبار سے ان کو اپنی ازدواجی زندگی واقعی ایک قید خانہ سے کم نہیں نظر آتی ہوگی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شادی نے مرزا صاحب کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے ایک رخنہ ڈال دیا اور ان کو یہ خواہش ہمیشہ ستاتی رہی کہ وہ اس قید خانہ سے رہا ہو جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان زنجیروں کو توڑ کر کہیں نکل جائیں اور خانہ بدوشوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے پھریں۔ لیکن جب بھی کسی آرزو نے چھیڑا اور کسی ولولے نے کروٹ لی تو انھوں نے اپنے دل کو "خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا"۔ علاوہ اس خواہش کے اور نہ جانے کون سی امنگیں ان کے حساس دل میں وقت کے ساتھ ابھریں جن کو ہر وقت ہی نے کچل بھی ڈالا ؎

"خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا"

اور ؎

"دائم الحبس ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ جانتے ہیں سینۂ پر خوں کو زنداں خانہ ہم"

یہ احساس اسیری جو تیرہ سال کی عمر سے شروع ہوا وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا حتیٰ کہ یہ ان کی پوری زندگی پہ چھا گیا مگر بجائے اس کے یہ ان کو فنا کر دیتا ان کے دراک ذہن نے خود اسی کو فنا کر دیا۔

"مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس"

سچ تو یہ ہے کہ محض دام ہی خالی نہ رہا بلکہ ان کے خلاق ذہن کی دفاعی قوتوں کے سامنے صیاد قضا و قدر کا ہر وار ہی خالی گیا۔

شادی کے بعد تقریباً دو برس تک مرزا صاحب آگرہ ہی میں رہے۔ اس عرصہ میں وہ مالی آسودگی اور آسائشیں برقرار رہیں جو عنقریب ختم ہونے والی تھیں۔ چنانچہ دہلی آنے کے بعد یہ صورت حال جلد ہی بدلنے لگی اور تلخ ترین تجربات، مالی پریشانیوں اور مصائب و آلام کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے نزدیک یہاں سے نہ صرف ان کی بچپن کی زندگی کا ایک دور ختم ہو کر ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے بلکہ یہیں سے ان کی نفسیاتی زندگی کا ایک باب بھی ختم ہوتا ہے۔ یہیں سے ایک تضادات شروع ہوتا ہے جو بعد میں بڑھتا چلا گیا۔ جب وہ دہلی منتقل ہوئے تو ان کا شعور تیری

سے پختہ ہو رہا تھا، اور ان کے تجربات پر ان کے ذہن کا فکری رد عمل شروع ہو چکا تھا۔ ان کو اظہار مدعا پر قدرت اور شعر پر ملکہ حاصل ہو رہا تھا۔ وقت کے ساتھ دہلی کے زنداں خانے کی تیرگی بڑھتی گئی اور مرزا صاحب کی زندگی فکروں اور مصائب میں گھرتی چلی گئی۔ وہ جب بھی اس زندگی کا موازنہ اپنی گذری ہوئی بے فکری کی زندگی سے کرتے تھے تو لامحالہ اس کے اظہار پر مجبور ہوتے تھے ؎

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبار شوق کسے — ذوق نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ ہی نہ رہا — شور سودائے خط و خال کہاں
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مدت ہوئی کہ "بادۂ شبانہ کی سرمستیاں" ختم ہو چکی تھیں اور وہ "لذتِ خواب سحر" جو آگرہ کی حویلی میں باوجود ساری محرومیوں کے حاصل تھی جا چکی تھی اور مرزا صاحب اب یہ سمجھنے لگے تھے کہ گردش ایام نے ان کو بھی اپنا ہی سا بنا لیا ہے۔ "ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں"۔

شادی کے بعد المناک حادثات کا سلسلہ ان کے بچوں کی موت سے شروع ہوا۔ ان کے سات بچوں میں سے کوئی بھی پندرہ ماہ سے زیادہ نہ جی سکا۔ وہ موت کو دیکھنے اور اس کے اثرات کو سہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ان کے ذہن سے پائیداری، طمانیت اور یکسوئی کا تصور بالکل ختم ہو چکا تھا۔ زندگی پر سے ان کا اعتماد بالکل اٹھ چکا تھا۔ بلکہ زندگی سے ان کو ایک قسم کی بے اعتنائی اور اکتاہٹ سی پیدا ہونے لگی تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسا جذباتی خلا پیدا ہو گیا تھا جو ایک فرد کو عام انسانوں کی روش سے بہت دور لے جاتا ہے اور جس کو انسان اپنی صلاحیتوں اور اپنے حالات کے مطابق کبھی تخلیقی کارناموں سے، کبھی محض شراب نوشی سے، کبھی زندگی سے فرار اختیار کر کے، کبھی جرم کر کے اور کبھی سیدھے سیدھے خودکشی کر کے پر کیا کرتا ہے۔ مرزا صاحب اپنی جوان العمری میں یہ محسوس کرتے تھے کہ ؎

"ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگ ناگہانی اور ہے"

اس عمر میں ان کا یہ شدید احساس ہم کو بتاتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے بالکل مختلف ہو چکے تھے اور زندگی ان کے لیے صرف یاس و الم اور محرومیوں تک محدود ہو چکی تھی۔ ان کی اس ذہنی حالت کا پتہ ایک خط کے مضمون سے چلتا ہے جو انھوں نے نومبر ۱۸۵۹ء میں مرزا یوسف کو لکھا تھا[۱]۔ وہ بتاتے

۱؎ خطوط غالب صفحہ ۲۲۴

ہیں کہ "میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے؟ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت ....." یہاں غم مرگ سے مراد ان کی وہ غم ہے جو اپنے قریبی اعزہ اور دوستوں کی موت سے ان کو لگا تھا۔ چنانچہ اسی خط میں لکھتے ہیں کہ" میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے" یہ خط اگرچہ ان کی وفات سے نو دس برس پہلے کا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ غم کا ہجوم مدتوں سے لگنا شروع ہو گیا تھا۔ قیام دہلی کے بعد تو وہ مسلسل اور بڑی تیزی سے غموں میں ڈوبتے چلے گئے۔ شدید مالی پریشانیاں، ذلتیں اور خواریاں، مقدمہ، ناداری اور کس مپرسی، صدمات غرض کہ زندگی ان کے فکر اور احساسات کی توثیق کرتی چلی گئی۔ جو بے یقینی کی ذہنیت ان میں شروع سے پیدا ہو گئی تھی وہ مستحکم ہوتی گئی اور وہ تمام عمر "مکتب غم دل" میں یہی سبق لیتے رہے کہ "رفت گیا اور بود تھا" ان کے لیے اگر کوئی چیز یقینی تھی تو وہ جو گذر گئی، باقی سب کچھ غیر یقینی اور ناقابل اعتبار تھا۔ ان کے لیے مستقبل کا تصور صرف یہ تھا کہ نہ جانے کیا ہو جائے۔ نہ جانے کون سی آفتِ ارضی و سماوی رہ گئی ہے جو ٹوٹ پڑے۔ یہ محض شاعرانہ بات نہ تھی بلکہ یہ کہنا ان کی نفسیات کا عین تقاضا تھا کہ "آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے"۔ مرزا صاحب کو جن چیزوں نے ایک عظیم المرتبت شاعر بنایا ان میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ انھوں نے اکثر جو کچھ کہا وہ محض کسی فوری ردعمل کے تحت نہیں کہا بلکہ ان کے پیچھے ان کے احساسات کا ایک طویل ردعمل اور فکر و خیال کا ایک دور دراز سلسلہ ہوتا تھا۔ جس کی ہر کڑی ایک ایسے تجربے سے وابستہ ہوتی تھی جو اپنے اثرات کے اعتبار سے ذہن کے عمیق ترین گوشوں تک پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تجربات معمولی اور سطحی نہیں ہوا کرتے چنانچہ شعر میں ان کی صدائے باز گشت بھی ایک ایسا عجیب و غریب اثر پیدا کر دیتی ہے کہ وہ بجائے کم ہونے کے اور بڑھتا رہتا ہے۔ یہ تجربات اگرچہ ایک فرد کے ہوتے ہیں اور صرف ایک فرد ہی کا ردعمل بھی ان پر ہوتا ہے مگر ان کی شعری آہنگ کی تہ میں احساس کی وہ گہرائی ہوتی ہے جس کی وسعتیں نہ جانے کتنے افراد کے احساسات کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔

مرزا صاحب نے اپنے غموں میں سے ایک غم یعنی غم رزق کا مداوا کرنے کے لیے جو کوششیں اپنی پنشن کو واگذاشت کرانے کے سلسلے میں کیں وہ ان کی مستقل مزاجی اور سخت کوشی کی دلیل ہیں۔ ان کی مالی پریشانیاں بہت حد تک ان کی مسرفانہ طرز زندگی کا نتیجہ تھیں۔ مگر زندگی کی اس روش کا تعلق محض ان کے بچپن اور عنفوان شباب کی عادتوں ہی سے نہیں تھا بلکہ اس احساس سے بھی تھا کہ وہ

ایک ایسے عالی مرتبت خاندان کے فرد ہیں جس کا سلسلہ ایران کے فرمانرواؤں سے ملتا ہے چنانچہ عسرت کی زندگی ان کے لیے ایک ننگ و عار تھی مگر وہ اس بات کو شاید نظر انداز کر چکے تھے کہ سود پر قرض لے کر اس شان و شوکت اور وضع داری کو برقرار رکھنا عسرت اور تنگدستی سے کہیں زیادہ برا تھا۔ مگر انھوں نے خودداری کے اس پہلو کو پکڑا جو خود پرستی پر ختم ہوتا ہے۔ قرض لینے کی ایک وجہ ان کا وہ مقدمہ بھی تھا جسے وہ اس وقت تک لڑتے رہے جب تک قانون اور دستور میں اس کی ادنیٰ سی گنجائش بھی باقی رہی۔ آگرہ چھوڑنے کے بعد جیسے جیسے ناسا عد حالات بڑھتے گئے ویسے ویسے ان کو یہ احساس بھی بڑھتا گیا کہ ان کا وہ دور جو بے فکری، آسائشوں، سکون اور آرام کا دور تھا شاید کبھی نہ لوٹے گا اور جتنا جتنا یہ ماضی ان سے دور ہوتا گیا اتنا ہی اتنا وہ ان کو حسین اور رنگین نظر آتا گیا۔ اس میں اگر کچھ تلخیاں تھیں بھی وہ ان کے ذہن سے محو ہونے لگیں۔ وہ اب بیک وقت دو طرح کی دنیا میں جی رہے تھے۔ ایک وہ دنیائے اندروں جو اس دور کی حسین یادوں کے سہارے پر قائم تھی اور جس میں ان کے تخیل نے چار چاند لگا دیے تھے۔ اور دوسری وہ خارجی اور حقیقی دنیا جس کے وجود کی شہادت ان کے حواس خمسہ دے رہے تھے جو نہایت ہی بے کیف، بے رنگ اور تلخ تھی اور گردش ایام جسے تلخ تر بناتی چلی جا رہی تھی۔ وہ نہ تو اپنے اندرون کی پُر کیف دنیا سے خود کو الگ کر سکتے تھے اور نہ ایک دیوانے انسان کی طرح خارجی دنیا سے انکار کر کے اپنا رشتہ اس سے منقطع کر سکتے تھے اور نہ ہی اس کو فنا کر سکتے تھے۔ ان کی فکری اور جذباتی وابستگی جس دنیا سے بڑھتی جا رہی تھی اور بڑھنا بھی چاہیے تھی، وہ یقیناً اندرون ہی کی دنیا تھی وہ ان کے لیے ایک ایسی نفسیاتی پناہ گاہ تھی جس کی فضا ان کے لیے زیادہ سازگار تھی۔ وہ ان کے شعر کا حاصل اور ان کی جستجو کا منتہا تھی اور یہ واقعہ ہے کہ وہ تمام تر ان کی آرزو بن چکی تھی۔ بالآخر انھوں نے اپنی ساری فکری قوتوں کو کام میں لا کر اس صورت حال کی توجیہ کی اور نتیجہ میں اس عالم رنگ و بو کو ناپائدار قرار دے دیا۔ انھوں نے اپنے دل اور دماغ کے متفقہ فیصلے سے یہ طے کیا کہ ؎

"جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے"

انھوں نے اپنے آپ کو اس خارجی حقیقت کے روبرو اس طرح متنبہ کیا کہ ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یہی وہ تعبیر تھی جو حقیقت سے قریب تر ہو سکتی تھی اور جس پر ان کے تجربات شاہد تھے اور جہاں ان کے احساسات اور ان کی عقل میں کہیں ٹکراؤ نہ ہوتا تھا۔ مگر پھر یہ سوال اٹھا کہ اس عالم ناپائیدار میں خود ان کی ہستی کیا ہے؟ وہ

کس کا مظہر ہے ؟ یہ وہ مقام ہے جہاں سے ان کا سیدھا سادہ فلسفہ اور تصوف ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جس عالم کی تصدیق ان کا دل و دماغ کر رہا ہے وہ اس دنیا سے پرے ہے جہاں فی الواقع وہ جی رہے اور جس مسرت کی جھلک وہ اپنے اندرون میں دیکھ لیتے ہیں وہ ایک دائمی مسرت بن سکتی ہے مگر یہ صرف اس عالم زمان و مکان سے نکل کر ہی ممکن ہے ؎

"عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

چنانچہ ان کے لیے اس دنیا میں خود ہی ایک ایسا طبعی عمل موجود تھا جو اس قید زمان و مکان سے نکال سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو عام طور پر واقع ہونے والے طبیعی عمل کی بھی یہی شاعرانہ توجیہ کرتے تھے ؎

"ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا   روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا"

اس مقام پر غالب اپنے فکر و شعر دونوں اعتبار سے اُن آخری بلندیوں تک جا چکے تھے جو ان کے لیے ممکن تھیں۔ یہاں ان کی غزل اپنے اثرات کے اعتبار سے بے پناہ ہو گئی۔ اس مقام پر ان کو اپنی ہستی اس مجموعی کائنات کی ایک چھوٹی سی تصویر نظر آتی تھی جو اسی قدر بلکہ اس سے کہیں ناپائیدار تھی۔ چنانچہ اس قید ہستی میں رہتے ہوئے اگر کوئی خواہش ان کے لیے قابل قدر ہو سکتی تھی تو وہ جو اس سے چھٹکارا پانے کی ہو اور یہ صرف خواہش مرگ ہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ موت مرزا صاحب کے لیے ایک ایجابی چیز بن گئی تھی۔ وہ ایک خوش آئند امکان تھی اور اس دائمی مسرت کے حصول کا ذریعہ تھی جس کی جھلک وہ افق ماضی کے دھندلکوں کے اندر سے دیکھ لیتے تھے اور جس کی رنگینی کو وہ کبھی کبھی شعر کے پیکر میں اتار کر اس بے رنگ حقیقت کے بالمقابل لے آتے تھے۔ چنانچہ اسی خوش آئند امکان کو ان کا احساس اس طرح آواز دیتا تھا ؎

"غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط   اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"

یہ صحیح ہے کہ موت کی آرزو کے پیچھے ایک حد تک ان کے احساس ناامیدی کو بھی دخل تھا جو طرح طرح کی اور پیہم نامرادیوں اور مایوسیوں نے ان کے اندر پیدا کر دیا تھا ان کا یہ کہنا کہ "آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا" اسی احساس کا آئینہ دار ہے۔ اپنی اس تصویر کو انھوں نے ایک جگہ الفاظ میں یوں کھینچا ہے ؎

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

اور یہ بھی اسی تصویر کا ایک رُخ ہے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیے"

اسی احساس ناامیدی کی شدت کے اعتبار سے موت کی آرزو بھی اپنی انتہا پر ملتی ہے ؎

"کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا"

"مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی"

اسی آرزو کی بے چینی نے ان سے یہ بھی کہلوایا کہ ؎

"موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟"

ان کی یہ امید ختم ہو چکی تھی کہ وہ جیتے جی کبھی بھی غم و آلام کی اندھیری سے نکل سکیں گے۔ زندگی اور غم کو انھوں نے ہم معنی اس لیے بنا لیا تھا کہ موت کا انتظار طول کھینچتا جا رہا تھا اور زندگی سے ایک عارضی مصالحت کرنا بھی ضروری تھا ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

"غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

بلکہ یہ آرزوئے ان کو اتنی عزیز تھی کہ اس کی خاطر کچھ دن جی لینا بھی ان کو منظور تھا ؎

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ • قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

مگر زندگی سے یہ عارضی مصالحت اور زندگی گوارہ کرنا ان کے اس رجحان بے اعتنائی اور بے یقینی کو بھی بڑھاتا جا رہا تھا جو انھیں زندگی کی طرف ہو چکا تھا۔ یہ رجحان ایک تحت الشعوری چیز تھی اور ان کی مجموعی شخصیت کا جزو لاینفک تھا۔ شعر میں یہ رجحان اس طرح ظاہر ہوتا تھا ؎

"اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے — جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا — دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں"

یہ دنیا اور اس کے بڑے سے بڑے واقعات ان کی وسعت نگاہ اور وسعت فکر و احساس کے سامنے محض ایک شمہ لیتے ؎

"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

ایک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک — ایک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے"

ان کے لیے اگر کوئی چیز پائیدار، بامعنی، دائمی اور لائق اعتماد تھی تو وہ جو ان کے حواس خمسہ کی دسترس سے باہر تھی اور جس کا راستہ موت سے ہو کر گزرتا تھا ان کا یہ احساس جو ان کی پوری ہستی کا آئینہ دار تھا در اصل اسی عالم کی تمنا سے پوری طرح ہم آہنگ تھا ؎

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے   جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

اس عالم سے دوری اور زندگی کی قید نے جو کشمکش پیدا کر دی اس کا تدارک صرف خواہش مرگ ہی سے ممکن تھا۔ موت چونکہ اتنی ہی بڑی اور اٹل حقیقت تھی جتنی زندگی لہذا مرزا صاحب کی خوددار طبیعت نے اس اٹل اور ہم پلہ حقیقت کو اپنی سب بڑی آرزو بنا کر زندگی کی اس آرزو کو شکست دے دی جس میں گرفتار رہنا ان کے لیے کوئی قابل قدر بات نہ رہی تھی۔ اس طرح وہ اس کش مکش سے نکل گئے جس سے صرف غیر معمولی انسان ہی عہدہ برآ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں جس قدر المناک واقعات و حادثات پیش آتے گئے اسی قدر وہ اپنے اندرون کی دنیا سے زیادہ وابستہ ہوتے چلے گئے اور اسی قدر ان کو اپنے انداز فکر پہ اعتماد بڑھتا گیا وہ اسی دنیا میں اپنی حسرتوں کے انبار لے جا کر لگاتے گئے کیونکہ وہ حسرتوں کے ساتھ زندہ رہنے کو ایک غیر معمولی بات سمجھتے تھے ؎

دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی   ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے

اس طرح جینا ان کی خودداری کا عین تقاضا تھا۔ حسرتوں کے بوجھ سے گھبرا کر فرار، شکست یا صلح جوئی ان کی غیرت کے منافی تھی۔ چنانچہ وہ اس سے شکست کھانے کو بالکل تیار نہ تھے۔ ان کی طبیعت میں ہمیشہ سے ایک ضد تھی اور شکست خوردگی سے ان کو شدید نفرت تھی۔ یہاں ان کا نسلی تفاخر اور ان کی شخصی غیرت اور خودداری مل کر کام کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں اس کی کئی مثالیں بھی موجود ہیں۔ سب سے اہم تو یہ بات ہے کہ مقدمے کے معاملے میں وہ کبھی بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھے یہ صرف اس لیے نہیں کہ ان کو روپیہ ملنے کی امید تھی بلکہ یہ ان کا مزاج بھی تھا۔ دوسری مثال یہ کہ وہ ملازمت سے الگ رہ کر زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ دلی کالج کی مدرسی کو انھوں نے صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ ایک انگریز نے کھڑے ہو کر ان کی تعظیم نہ کی۔ غیرت اور ضد کی بنا پر ہی وہ سخت کوشی کے بھی عادی ہوئے چنانچہ اس دور کا سب سے لمبا سفر کرنے میں ان کو کوئی تامل نہ ہوا۔

مرزا صاحب جس دور میں پیدا ہوئے اور جس میں ہوش سنبھال کر انھوں نے اپنے چاروں طرف دیکھا اس میں بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام "مغلوں کا زوال اپنے شباب پر تھا" انھوں نے یہ محسوس کیا کہ غم صرف ان کی انفرادی زندگی ہی کو نہیں گھیرے ہوئے ہے بلکہ اس کے آثار تو ہر طرف نمایاں ہیں چنانچہ غم ان کو اپنے اندر اور چاروں طرف محیط نظر آتا تھا ؎

"رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا   جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے   کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے | اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

مگر مرزا صاحب اپنے مخصوص مزاج اور خودداری کی بنا پر غم کو شکست حوصلگی کا ذریعہ بنانے کے لیے تیار نہ تھے ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس | برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

مغلوں کی قوت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ چونکہ خود بھی مغل تھے اس لیے اپنی نسل کے فرمانرواؤں کے دورِ عروج کو ماضی کے دھندلکوں میں تخیل کی اس آنکھ سے بخوبی دیکھ سکتے تھے جس میں احساس کی بصارت غایت درجہ تھی۔ یہاں پر پھر وہی حال و ماضی ایک دوسرے کے بالمقابل روشنی اور تاریکی کے پرے جمائے موجود نظر آتے تھے۔ ایک رنگین اور روشن ماضی کے سامنے حال ایک المناک منظر پیش کرتا تھا۔ یہ منظر بہت کچھ ان کی انفرادی زندگی کے مناظر سے مماثلت رکھتا ہے۔ غالبؔ چونکہ تاریخ سے نہ تو زیادہ واقفیت رکھتے اور نہ دلچسپی اس لیے ماضی کا تصور ان کے یہاں ہرگز وہ نہیں ہو سکتا تھا جو ایک مورخ کے یہاں ہوتا ہے۔ یعنی ایک مورخ ماضی کے تاریک خد و خال سے بھی واقف ہوتا ہے۔ غالبؔ بہ حیثیت شاعر کے اس کے صرف روشن خد و خال دیکھ سکتے تھے جس میں ایک شاعر کا احساس رنگ بھر کر اُسے کچھ سے کچھ بنا سکتا ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب کے ذہن میں ماضی کا تصور ایک بڑا وسیع تصور تھا۔ جس میں ان کا اپنا ماضی، ان کے خاندان کا ماضی، اور ان کی نسل کا ماضی سب کچھ شامل تھے اسی ماضی کا موازنہ وہ حال سے کیا کرتے تھے ؎

یا شب کو دیکھتے کہ ہر گوشۂ بساط | دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ | یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں | نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی | اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یہی موازنہ ان کو جذباتی طور پر ماضی سے زیادہ وابستہ کرتا تھا۔ اس وابستگی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ رجعت پسند تھے۔ ماضی کی محبت اور رجعت پسندی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ رجعت پسند کو حال و حاضر کے ہر اچھے پہلو سے بھی نفرت ہوا کرتی ہے۔ مرزا صاحب میں حال سے اس قسم کی کوئی بیزاری نہیں تھی۔ نظم و نثر دونوں میں ان کی اپنی نئی طرز، ان کی بے لاگ تنقید اور آئین اکبری کی بابت ان کے خیالات اس بات کا کافی ثبوت ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو ان کو اپنے اندر اس بنا پر ایک کش مکش کا احساس ہوتا تھا کہ ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر　　کعبہ مرے پیچھے تو کلیسا مرے آگے

البتہ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ماضی کو فراموش کر کے حال میں خود کو گم کر دیں کیونکہ ایسا کرنے سے ان کی وہ شخصیت شاید پارہ پارہ ہو جاتی جس کی نفسیاتی شیرازہ بندی ماضی کے تصورات اور احساسات سے ہوئی تھی۔ اپنی انفرادی زندگی میں وہ احساسات کے اعتبار سے حال سے صرف ایک مصالحت سی کیے ہوئے تھے۔ ان کے طرز عمل میں البتہ اس مصالحت کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ مگر یہ بات کوئی غیر معمولی چیز نہ تھی۔ آگرہ کے دو ایک مغل خاندانوں کا یہی طرز عمل رہا ہے۔ غدر سے پہلے ان کے قلعہ معلیٰ کے تعلقات اور بعد کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ہمدردیوں کا پلہ پوری طرح کسی ایک طرف نہیں جھکا یا تھا۔ انھوں نے اپنے ذاتی تحفظ کو ہر جگہ مقدم رکھا۔ وہ ایک طرف خودداری کی بنا پر انگریزی کی ملازمت کو ٹھکرا سکتے تھے مگر دوسری طرف مالی منفعت کے لیے قصیدے لکھ سکتے تھے۔ علاوہ اور انسانی کمزوریوں کے یہ تضاد ہمیشہ ان میں رہا مگر ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ بہت حد تک مجبور بھی تھے۔ ممکن ہے کہ اگر مجبور نہ ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ چنانچہ ایک جگہ مرزا تفتہ کو انھوں نے اس بارے میں یوں لکھا ہے۔ "کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے مدح کے کم تر[۵]" ان کی خوددار ذہنیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے ہجو اور ہزل گوئی کو اپنے معیار شاعری سے فروتر سمجھا۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہزل اور ہجو میرا آئین نہیں"

۱۸۵۰ء میں وہ قلعۂ معلیٰ سے بسلسلہ ملازمت وابستہ ہو گئے مگر یہاں بھی کم و بیش وہی ہوا کہ "تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا" انفرادی موتوں کی ہولناکیاں تو گزر چکی تھیں، اب مرگ انبوہ کا جشن دیکھنا اور ان کی قسمت میں لکھا تھا چنانچہ وہ انھوں نے دیکھا جو کچھ ان پر گزری وہ خود ان ہی کے احساسات میں ڈوب کر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ۱۸۵۹ء تک ان کے زیادہ تر دوست یا تو پھانسی پر لٹکائے جا چکے تھے یا مفقود الخبر ہو چکے تھے۔ مرزا صاحب بوڑھے ہو چکے تھے۔ عناصر کا اعتدال ختم ہو چکا تھا۔ وہ تقریباً اب تنہا تھے، شاعری ترک کر چکے تھے۔ جو کچھ جوانی میں سوچا اور محسوس کیا اب اس کا حاصل یعنی موت کی آرزو اور اس کے فراق میں مضطرب رہنا اور آنسو بہانا ان کی قسمت بن چکا تھا۔ وہ اب محض اپنی طاقت دیدار ہی کو دیکھ کر نہیں بلکہ اپنی آتی اور جاتی سانسوں سے بھی جلنے لگے تھے۔

---

۵) کلیات نثر پنج آہنگ ع ۲۱ بحوالہ دیوان عرشی صفحہ ۵۳۔ انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ

وفات سے کچھ عرصہ قبل وہ جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی اعتبار سے بھی خود کو اپاہج سمجھنے لگے تھے۔ ان کے بیان مطابق ان کی حالت یہ تھی کہ "کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت" یہ نفرت بالکل بجا تھی۔ ان کے حالات کا عین تقاضہ تھی۔ بلکہ اگر نہ ہوتی تو حیرت کا مقام تھا۔ وہ خود کہتے تھے کہ جب گاہ گاہ دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔ ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

تعجب ہوگا اگر مرزا صاحب کی پُر از آلام زندگی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور نہ کرے کہ آخر وہ کون سی اندرونی قوت تھی جس نے ان کی شخصیت کے شیرازے اور ان کے ذہن کے اعتدال کو برقرار رکھا۔ کوئی یقین؟ کوئی مقصد؟ کوئی امید؟ جن باتوں کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی چیزوں کے اجتماع نے مرزا صاحب کو قبل از موت مرجانے سے بچالیا۔ پہلی چیز تو یہ کہ ان کی تخلیقی قوت جو بچپن میں بروئے کار آگئی تھی، ان باتوں کا ازالہ کرنے کا ایک موثر ذریعہ تھی جو انسانی ذہن کو درہم برہم کردیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی فکری قوت نے واقعات اور حادثات کی اس طرح توجیہ کی کہ وہ ذہن کو اتنا شدید دھکا نہ پہنچا سکے جو ابتری کی صورت پیدا کردیتا۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے اپنے احساسات کی شدت اور اپنے یقین کی بنا پر اپنے اندروں میں ایک ایسی دنیا بنالی جس میں وہ نفسیاتی طور پر پناہ لے لیا کرتے تھے۔ غم و آلام سے تھک کر وہ ذہنی اور جذباتی طور پر اسی دنیا میں خود کو محو کردیتے تھے۔ یہ محویت ان تکلیف دہ باتوں کا ازالہ کردیتی تھی جو عالم حقیقت میں ان کو پیش آتے تھے۔ یہ "ایک گونہ بے خودی" ان کے لیے اس وجہ سے ضروری تھی کہ اس محویت کا اثر اس حسین اور رنگین خواب کے اثر سے کچھ کم نہ ہوتا تھا جہاں انسان کی بہت سی چھپی والی خواہشات پوری ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے ایک ناقابل حصول آسودگی کے تصور کو ختم کرکے ایک ایسے تصور کو اپنالیا تھا جو ان کی مشکلوں کا بار نہ صرف سہہ سکتا تھا بلکہ اسے کم بھی کرسکتا تھا۔ اور یہ سب کچھ عبث نہ تھا کیونکہ شعر اس کا حاصل تھا۔ تخلیقی قوت اس کی روح رواں تھی۔ شعر کے پیکر میں ان کی یہ تخلیقی قوت محض ذہنی آسودگی کا سامان ہی نہیں فراہم کرتی تھی بلکہ وہ بذات خود ایک ہمہ گیر تجربہ تھا کہ جس کے اثرات ان کی شخصیت پر طرح طرح سے پڑتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تخلیقی عمل میں نہ صرف ان کے تحت الشعور کی کارفرمائی کو دخل تھا بلکہ ان کا شعری وجدان ماورائے شعور (SUPRA CONSCIOUS)

کی بلندیوں سے تخلیقی عمل کو متحرک کرتا تھا۔ چنانچہ ان کا یہ تجربہ اس اعتبار سے ماورائے شعری
(TRANS-POETIC) کہا جا سکتا ہے۔ جدید نفسیات نے جتنی معلومات اب تک لاشعور کی بابت
فراہم کی ہیں اس کی عشر عشیر بھی ماورائے شعور کی بابت نہیں کیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ یہ تاریخ نفسیات
کی ایک ایسی بحث ہے جسے ہم یہاں نہیں چھیڑ سکتے۔ مرزا صاحب کی غزل کی شعری ماورایت ان کے
اس تجربے کی شاہد ہے۔ ان کی اصطلاح میں "نوائے سروش" تھی جو ماورائے شعور کے پردۂ غیب
سے ان کے لیے مضامین فراہم کرتی تھی۔

ماورائے شعور کا تجربہ جس درجہ ان کی دنیائے اندرون سے ہم آہنگ تھا وہ ان کی ہر آن زندہ
رہنے والی خواہش مرگ بتاتی ہے جس کے ذریعہ وہ زمان و مکان کی زنجیروں کو توڑ سکتے تھے۔ اور جس
کو ان کے متصوفانہ فکر و مزاج نے ایک باقاعدہ شکل دے کر اس قید خانۂ عالم میں چند دن گزارنے
کے لیے ایک سہارا بنا دیا تھا۔ مرزا صاحب کا یہ شعری وجدان ایک ایسے ہمہ گیر وجدانی عمل کا جز تھا
جو ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کیے تھا۔ مگر یہ وہ مقام ہے جہاں مرزا اسد اللہ خاں غالب کی عظیم شخصیت
کی تحلیل ہوتی ہوئی پرچھائیوں کے ساتھ اس کے نقوش نہ صرف دھندلے پڑنے لگتے ہیں بلکہ اس قدر اوجھل
ہو جاتے ہیں کہ ہم اب ان کی وفات کے سو سال بعد انھیں نفسیات کی روشنی میں دیکھنے سے بالکل قاصر ہیں۔

ہاں! البتہ صرف ایک لمحہ کے لیے ہمیں ایک مانوس سی آواز اس افق شہود سے پرے کسی نامعلوم
سمت کی وسعتوں میں گم ہوتی ہوئی اس طرح سنائی دیتی ہے ؎

"بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا"

کبیر احمد جائسی

غالب کی فارسی غزل گوئی

فارسی غزل گوئی کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ وجود پذیر ہوئی تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ کیوں کہ اوّل اوّل قصیدہ کے تمہید کے طور پر جو عشقیہ اشعار لکھے جاتے تھے اُن ہی اشعار کو قصیدہ سے الگ کر کے اُن کو ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت دی گئی اور اس کا نام غزل رکھا گیا۔ بعد میں یہ صنف سخن اپنی جاذبیت جذبات کی عالمگیری اور حُسن بیان کی وجہ سے تمام اصناف سخن پر غالب آتی گئی اور بعض بعض ادوار تو ایسے گزرے ہیں جن میں صرف اسی صنف سخن کا چراغ جلا ہے۔ فارسی کے ابتدائی دور کی غزلیں اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے کوئی خاص بلند مرتبہ نہیں رکھتیں اور ان کی جو کچھ بھی اہمیت یا حیثیت ہے وہ تاریخی ہے ادبی نہیں۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ "سب سے پہلے حکیم سنائی نے غزل کو ترقی دی اور اُن کے بعد اوحدی مراغی نے غزل کو جذبات سے لبریز کر دیا۔"[۱] اس کے بعد عطار، مولانا روم، عراقی وغیرہ نے غزل کو بہت ترقی دی۔ اسی زمانہ میں شیخ سعدی نے غزل کو ایک نیا قالب عطا کیا۔ اور غزل اپنے تنوع مضامین کی وجہ سے دوسری اصناف سخن پر حاوی اور اُن سے ممتاز نظر آنے لگی۔ سعدی کے بعد سلمان اور خواجو نے اپنی اپنی بساط بھر غزل کو ترقی دینے کی کوشش کی ابھی ان لوگوں کی آوازیں کانوں میں گونج ہی رہی تھیں کہ حافظ نے ایک نئی آواز بلند کی اور غزل کی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ خواجہ حافظ نے اپنے وسیع تجربات کی مدد سے غزل کو ایسا پیکر عطا کیا کہ وہ "ورائے شاعری" نظر آنے لگی۔ جس وقت خواجہ حافظ کا انتقال ہوا اس وقت ایران میں طوائف الملوکی اپنے پورے عروج پر تھی۔ جس کی وجہ سے ادبیات ایران میں بڑا زبردست انتشار رونما ہوا اور اسی انتشار کی وجہ سے غزل کے ساتھ ساتھ ہر صنف سخن کی ترقی رک گئی۔ جب حکومت صفویہ قائم ہوئی اور اس کو استحکام نصیب ہوا تو شعر و شاعری کا بازار پھر سے گرم ہوا۔ اس دور تک آتے آتے لوگوں کی طبیعت حافظ کی لے سے بھر چکی تھی۔ اور لوگ کسی نئی آواز کے سننے کے متمنی تھے۔ چنانچہ فغانی کی شاعری میں لوگوں کو یہ نئی آواز ملی اور اُن کی شاعری اتنی مقبول ہوئی کہ نظیری اور عرفی جیسے صاحبان

---

[۱] شعر العجم ج پنجم ص ۳۵، مطبوعہ دار المصنفین سنہ ۱۹۴۲ء

طرز تک ان کی آواز میں آواز ملا کر غزل سرا ہوتے رہے۔ نظیری، صائب اور عرفی و طالب کا دور ہند ایرانی شاعری کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ ان شعراء کے بعد صرف ایک ہی شاعر قابل ذکر رہ جاتا ہے۔ یعنی کلیم ہمدانی۔ اگرچہ کلیم کے انتقال کے بعد بھی ہندوستان میں فارسی شاعری ہوتی رہی۔ لیکن اس شاعری کو اگر ہم شاعری کی نقل کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ اس دور میں دقت پسندی، مضمون آفرینی اور خیال بندی کا دور دورہ ہوا اور شاعری اصل جذبات اور حقیقی احساس کی ترجمان نہ رہ گئی۔ بلکہ ایک مصنوعی فن بن کر رہ گئی۔ اور رفتہ رفتہ جب ناصر علی سرہندی اور بیدل کا دور آیا تو شاعری مصنوعی جذبات کا ایک بے جان انبار بن چکی تھی۔ اگرچہ بیدل نے غزل کی آبیاری میں اپنے خون جگر کا ایک ایک قطرہ صرف کر دیا۔ لیکن اس زمانہ میں جو طرز بیان بن چکا تھا اس کی وجہ سے ان کی بیشتر کاوشیں بیکار ہی گئیں اور ان کے بہت سے اشعار معنی سے تہی نظر آنے لگے ناصر علی اور بیدل کے بعد غالب کا دور آتا ہے جب کہ غزل گوئی کی اگلی طرزیں منسوخ ہو چکی تھیں۔ اس لیے ان کو ایک نئے طرز کے اختراع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قبل اس کے کہ ہم غالب کے طرز کے سلسلہ میں کچھ کہیں بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے کی مختلف طرز کی کچھ غزلیں یہاں ہم نمونہ کے طور پر درج کر دیں۔

رنگ سعدی و حافظ۔

اگرم حیات بخشی وگرم ہلاک خواہی — سر بندگی بحکمت بنہم کہ پادشاہی
غم عشق اگر بکوشم کہ دوستاں بپوشم — سخنان سوزناکم بدہد بروگواہی
تو بآفتاب مانی بکمال حسن و طلعت — کہ نظر نمی تواند کہ ببیندت کماہی
من اگر ہزار خدمت بکنم گناہ گارم — تو اگر ہزار چو من بکشی کہ بے گناہی
خضری چہ کلک سعدی ہمہ روزہ در سیاحت — نہ عجب کہ آب حیواں بدر آمد از سیاہی (سعدی)

ایکہ با سلسلۂ زلف دراز آمدۂ — فرصت باد کہ دیوانہ نواز آمدۂ
ساعتی ناز مفرما و بگردان عادت — چوں بہ پرسیدن ارباب نیاز آمدۂ
پیش بالای تو میرم چہ بصلح و چہ بجنگ — چوں بہر حال برازندۂ ناز آمدۂ
آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب — کشتۂ غمزۂ خود را بنماز آمدۂ
گفت حافظ دگرت خرقہ شراب آلودست — مگر از مذہب ایں طائفہ باز آمدۂ

طرز فغانی و مقلدین فغانی:۔ اس طرز کی خصوصیت یہ ہے کہ بات کو بہت زیادہ سادگی اور صفائی سے نہیں کہتے بلکہ بات کسی قدر پیچیدہ کر دی جاتی ہے اس کے علاوہ اختصار کلام اس طرز میں خاص طور سے مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس طرز کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں ایک طرز تو وہ ہے جس کے ذیل میں فغانی، نظیری، صائب اور عرفی کی غزلیں آتی ہیں جو مذکورہ بالا اوصاف کی حامل ہیں۔ دوسری شاخ وہ ہے جس میں شفائی، وحشی، یزدی اور شرف قزوینی وغیرہ کی غزلیں آتی ہیں

جس میں بات کو بہت زیادہ پیچیدہ انداز میں تو نہیں کہتے۔ لیکن جذباتیت حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے ہم اس موقع پر ہر قسم کے چند اشعار یہاں درج کرتے ہیں۔

بیخودی در عشق بازی باد و رسوائی مباد / درد باد و ملامت، ناشکیبائی مباد
رستم از قید خرابات و اسیر عشق را / همدمی جز با گرفتاران شیدائی مباد
بی تو غیر از نالهٔ جانسوز و آه جانگداز / عاشقان را همدم شبهای تنهائی مباد
بی فروغ شمع رخسار تو ای چشم و چراغ / دیده را شب زنده داری باد و بینائی مباد
در حریم چشم و دل بادا جمالت جلوه گر / شمع را کار بغیر از مجلس آرائی مباد (فغانی)

میفروشم راحت و عشق ستمگر میخرم / میدهم روز خوش و آسیب اختر میخرم
در سرشت من قبول شیوهٔ انکار نیست / ساده لوحم هر چه بفروشند یکسر میخرم
نیست غم کز درد هجران شهپرم بر خاک ریخت / اینک از جبریل شوقت باز شهپر میخرم
هر متاعی کز نگاهش میخرم در بزم وصل / می نشینم گوشهٔ و ز خود مکرر میخرم
عرفی آوردم متاعی نزاز د گوئم کجاست / کان متاعِ کس مخرباں جان برابر میخرم (عرفی)

جذباتی رنگ:-

انجام حسن او شد، پایان عشق من هم / رفت آن نوای بلبل، بی برگ شد چمن هم
کرد آن چنان جمالی، در کنج خانه ضایع / بر عشق ما ستم کرد، بر حسن خویشتن هم
بدمستی غرورش هنگامه گرم نگذاشت / افسرده کرد صحبت، برهم زد انجمن هم
آن بت که بود افتاد از طاق کعبهٔ دل / وز کفر شد پشیمان، آن کافر کهن هم (وحشی)

بهر مجلس که جا سازم حدیث نیکوان پرسم / که حرف آن مه نامهربان را در میان پرسم
چنان گویم جواب من کزان گردد رقیب آگه / بمجلس گر من بیدل ازو حرف نهان پرسم
ز حال او اگرچه آگهم بیش از همه لیکن / ز بیتابی شوق احوال او از این و آن پرسم
ز مدهوشی نفهمم هرچه گوید آن پری از من / چوں از بزمش ار دم مضمون آن از دیگران پرسم
(شرف قزوینی)

طرز ناصر علی و بیدل:- دقت آفرینی، مضمون بندی اور خیال آفرینی اس طرز کی خاص خصوصیات ہیں۔

غبار حیرت دل تاب حسن بی حجابش را / که باشد صافی آئینهٔ شبنم آفتابش را
نظرها غافل و عالم پر از کیفیت حسنش / بود حکم پری در شیشهٔ هر رنگ شرابش را

بشوخی پائی او بوسیدن و قالب تہی کردن — کدامیں بی ادب تعلیم فرما شد رکابش را
درین صحرا کدامین تشنہ لب جان داد حیرانم — کہ از صد جا گریباں پارہ شد موج سرابش را
بمحشر حرف بی صوتست فریاد شہیدانش — نمی دانم کہ داد ایں سرمہ چشم نیم خوابش را (ناصر علی)

بازآب شمشیرت از بہار جوشی ہا — داد مشت خونم را یاد گل فروشی ہا
نالہ تا نفس ورزید من بسرمہ خوابی دم — کرد شمع ایں محفل داغم از خموشی ہا
یا تغافل از عالم یا ز خود نظر بستن — زین دو پردہ بیروں نیست ساز عیب پوشی ہا
مایہ دار ہستی را لاف ما و من ننگ است — بی بضاعتاں دارند عرض خود فروشی ہا
محرم فنا بیدل زیر بار کسوت نیست — شعلہ جامہ دارد از برہنہ دوشی ہا (بیدل)

ہمارے خیال میں اگر فارسی غزلوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو اس میں اتنے ہی رنگ ملیں گے۔ ہم نے قصداً عرفانی یا متصوفانہ غزلوں کو ایک الگ رنگ کا حامل نہیں لکھا ہے کیوں کہ ہمارے خیال میں یہ عرفانی غزلیں، جذباتی رنگ کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان رنگوں یا طرزوں کے غائر مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ رنگ سخن دو منابع سے نکلتا ہے۔ شروع کے تمام رنگوں کا منبع دل ہے اور آخر الذکر رنگ کا منبع دماغ، اس لیے اگر ہم متاخرین کی شاعری کو دماغی شاعری کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

غالب کے دور تک آتے آتے ہندوستان کی فارسی یکسر دماغی شاعری ہو کر رہ گئی تھی اور اب شاعری کا کام جذبات و احساس کی ترجمانی نہیں بلکہ فن مہارت اور چابک دستی کا ثبوت دینا تھا، اسی وجہ سے دقت پسندی، مضمون آفرینی اور خیال بندی اس شاعری کا خاصہ ہیں۔ غالب نے اپنے لیے جو راہ لی وہ اسی تخیلی یا دماغی شاعری سے میل کھاتی ہے۔ وہ حافظ و سعدی کے معترف ہونے کے باوجود اُن کے طرز و آہنگ کو اس لیے نہ اپنا سکے کہ اس فضا میں اُن کو اپنی فنی مہارات کی نمائش کا موقع نہ ملتا۔ فغانی اور ان کے متبعین نظیری، عرفی وغیرہ کا پورا پورا احترام کرنے کے باوجود غالب اُن کے رنگ کو بھی نہ اپنا سکے۔ کیوں کہ اس طرز میں بات کو جس انداز سے کہنا ہوتا ہے ان کی فکر سخن اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ جہاں تک جذباتی رنگ کا سوال ہے غالب اس کو بھی نہ اپنا سکے۔ کیونکہ اس رنگ کو اپنانے کے لیے سارے جہاں کا درد ایک ہی جگر میں جمع ہونا چاہیئے اور غالب صرف اپنے درد جگر سے سروکار رکھنے والوں میں تھے۔ لے دے کے وہی رنگ سخن بچا جس کو ہم دقت پسندی، خیال آفرینی اور مضمون آفرینی کا رنگ کہتے ہیں یہی وہ رنگ تھا جو غالب کے طرز فکر سے میل کھاتا تھا اس لیے انھوں نے اسی رنگ کو اختیار کیا مگر چوں کہ ان کے یہاں خانۂ دل میں حافظ، سعدی، عرفی، نظیری وغیرہ سب کی عزت موجزن تھی اس لیے بعض اوقات ان کی شاعری پر اُن کا عکس بھی جلوہ گر ہوا اور یہ دو متضاد رنگ مل کر غالب کی شاعری کو ایک ایسا عجوبہ بنا دیتے ہیں جس کی ستائش مشکل ہی

سے ممکن ہے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا نظریۂ شاعری وہی ہے جس کو نظامی عروضی سمرقندی نے اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا ہے۔

"شاعری صناعتیست کہ شاعر بدان صنعت اتساق مقدمات موہمہ کند و التیام قیاسات منتجہ بر آنوجہ کہ معنی خرد را بزرگ گرداند و معنی بزرگ را خرد، و نیکو را در خلعت زشت باز نماید و زشت را در صورت نیکو جلوہ کند، و بایہام قوت ہائی غضبانی و شہوانی را بر انگیزد تا بدان ایہام طباع را انقباضی و انبساطی بود و امور عظام را در نظام عالم سبب شود[1]...."

غالب کی فارسی غزلوں کے مطالعہ کے بعد ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ شاعری صناعت ہے اور جب شاعری کو صناعت مان لیا گیا۔ تو پھر صناعت کے تمام لوازم اس میں آنے ضروری ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ صناعت میں انسان کا شعور اور اس کی بار بار کی محنت شامل ہوتی ہے یعنی انسان شعوری طور پر ایک پیکر تراشتا ہے۔ اور اس کو بار بار کی محنت، اضافہ و ترمیم کے بعد جب مکمل سمجھتا ہے تو نمائش کے لیے پیش کرتا ہے۔ دماغی شاعری کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ شاعر شعوری طور پر ایک خاص خیال یا مضمون کو منتخب کر کے اس کی مناسبت سے الفاظ پہ الفاظ جڑتا چلا جاتا ہے۔ اور جب تک فنی حیثیت سے وہ مکمل نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک اس میں ترمیم و اضافہ جاری رہتا ہے۔ غالب قدرت کی طرف سے ایک جدت پسند طبیعت لے کر آئے تھے اور کچھ انھوں نے اکتسابی طور پر اپنی طبیعت کو اس لیے جدت پسند بنا لیا تھا کہ وہ انسانوں کی بھیڑ بھاڑ میں خود کو سب سے الگ اور ممتاز کر سکیں۔ اس لیے انھوں نے دماغی شاعری میں بھی اپنی جدت پسندی کا رنگ بھرنے کی کوشش کی اور اس کو اپنے زمانہ کی مروجہ دماغی شاعری سے الگ کرنے کے لیے اس میں گاہ گاہ جذباتی یا عرفانی رنگ بھی ملاتے رہے۔

نظامی عروضی نے جس بات کو "اتساق مقدمات موہمہ" کہا ہے وہ غالب کے مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ماہمای گرم پرواز یم فیض از ما مجوی
سایہ ہم چوں دود بالا میرود از بال ما

سایہ و چشمہ بصحرا دم عیسی دارد
اگر اندیشۂ منزل نشود رہزن ما

نشستن بر سر راہ تحیر عالمی دارد
کہ ہر کس میرود از خویش میگیرد دو چار ما

زغیرت می گدازد در خجالت گاہ تا ثیرم
زبون دیدن بدست شیشہ سازان کوہساران را

خیال وحشت از ضعف روان صورت نمی بندد
بیاباں بال برنگہ دامان ناز افشاندہ است امشب

[1] چہار مقالۂ نظامی عروضی سمرقندی، ص ۳۳، ۳۴ مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۲۲ء

موجه از دریا شعاع از مهر حیرانی چرا ست
محو اہل مدعا باش و بہ اجزا کش بہیچ

منال از غم و ساز عیش کن کز باد نوروزی
بگلشن جلوهٔ رنگینی عہد شبابستی

مرو ز آئینه خانه که خویش تماشائیست
یکے تو محو خودی و چہ تو ہزار یکے

از قافلهٔ گرم روان تو نه باشد
رختی که بسیلش شرر اندود نیابی

اور جس چیز کو نظامی عروضی نے "معنی خرد را بزرگ گرداند و معنی بزرگ را خرد، و نیکو را در خلعت زشت باز نماید و زشت را در صورت نیکو جلوہ کند"، کہا ہے اس کی مثالیں غالب کے اشعار میں یوں ملتی ہیں۔

در خم بند تغافل نالم از بے داد عمر
پردهٔ ساز فغانم لغزش چشم قاتل است

از جلوه بہنگامہ شکیبا نتواں شد
لب تشنهٔ دیدار ترا خلد سرابیست

تلخ است تلخ رشک تمنای خویشتن
شادم که دل بوصل تو نومید بوده است

شادی و غم همه سرگشته تر از یک دگر اند
روز روشن بوداع شب تار آمد و رفت

داغیم زگلشن که بہارست بقا، ہیچ
شادیم بگلخن که خزانست و خزاں نیست

پیمانه رنگیست دریں بزم بگردش
ہستی ہمه طوفان بہارست و خزاں، ہیچ

تبسمیست ببالین کشتگان خودت
که گل بجیب تمنائے خونبہا ریزد

ہرچه بینی بجہاں حلقهٔ زنجیری ہست
ہیچ جانیست که ایں دائرہ باہم نرسد

خار ز جاده باز چیں سنگ بگوشه درفگن
در سر راه گرفتنش ترک بہانہ کرده ایم

صناعت کی تیسری تعریف یہ کی گئی ہے کہ "بایہام قوت ہائے غضبانی و شہوانی را برانگیزد تا بداں ایہام طباع را انقباضی و انبساطی بود۔۔۔" اس کی مثالیں غالب کے اشعار میں اس شکل میں ملتی ہیں۔

خود را بشاہدی بپرستیم زیں سپس
در راہ عشق جادهٔ دیگر گزینیم ما

سرابی که رخشد بویرانه خوشتر
زچشمی که پیرایهٔ نم ندارد

کشتهٔ دعوی پیدائی خویشیم ہمه
وادی گر پرده ازیں راز نہاں برخیزد

مجو آسودگی گر مرد راہی کاندریں وادی
چو خار از پا بر آمد پا ز داماں بر نمی آید

در بادهٔ اندیشه ما درد نه بینی
در آتش ہنگامه ما دود نیابی

جلوه و نظاره پنداری که از یک گوہرست
خویش را در پردهٔ خلق تماشا کرده

فرصتم باد که مرہم نه ز زخم جگرست
خنده بر لب اثری ہائی نمکداں زده

بگوشم می رسد از دور آواز درا امشب
دلی گم گشته دارم که در صحراست پنداری

بہرہ از وجودم نیست زیں کشش کشودم نیست — یاد داغ رفتاری دست و حسرت کاری
ما ہم بلاغ ولا بجسلی شویم کاش — نادان ز بزم دوست چہ خشنود میرود
از نالہ ام مرنج کہ آخر شد سست کار — شمع خموشم و ز سرم دود میرود
گر بمعنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم است — شکن زلف و سر طرف کلاہی دریاب
ازاں بگلشن گیتی نشاطی ورزی — کہ بوی زہر ہمی نشنوی ز ریحا نش
ریزد آں برگ وایں گل افشا ند — ہم خزاں ہم بہار در گذر است
بی تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست — قعر دریا سلسبیل و روی دریا آتش است

ہم نے یہاں پر قصداً نظامی عروضی کی تیسری شرط کے آخری ٹکڑے کو چھوڑ دیا ہے۔ یعنی "امور عظام را در نظامِ عالم سبب شود" کی شرط سے صرف نظر کیا ہے۔ کیوں کہ ہمارا خیال ہے کہ یہ شاعری کا نہیں بلکہ سیاست کا منصب ہے۔ شاعری کا منصب تو وہاں پر ختم ہو جاتا ہے جہاں پر "طباع را انقباضی وانبساطی بود" کی منزل آجاتی ہے۔

اگر مذکورہ بالا اشعار کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس رنگ میں خونِ دل کی آمیزش نہیں ہے لیکن دماغی کاوش بدرجۂ اتم موجود ہے ہم جانتے ہیں کہ دل کی دنیا میں ربط و ترتیب، نظم و ضبط اور منطق کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان کے احساسات وجذبات ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ شاعری جو صرف دل کی ترجمانی کرتی ہے وہ اگرچہ انسانی احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتی ہے لیکن ربط و ترتیب، نظم و ضبط اور منطقی استدلال یا اخذ نتیجہ سے عاری ہوتی ہے اسی وجہ سے بعض اوقات محسوسات کی شاعری جو تصویر یا پیکر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے وہ ہماری دنیا کی تصویر یا پیکر نہیں معلوم ہوتا اس کے برعکس دماغی شاعری اگرچہ جذبات کے سوز و گداز اور احساس کی دردمندی سے عاری ہوتی ہے۔ لیکن ربط و ترتیب اور منطقی استدلال کی مکمل ترجمان ہوتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو حیات و کائنات پر فلسفی کی طرح نظر ڈالتے ہیں۔ اگر وہ اپنی شخصیت اور اپنے خیالات کی ترجمانی کا کام شاعری سے لیتے ہیں تو اُن کی شاعری دماغی شاعری کی مثال بن جاتی ہے۔

ہمارے اس خیال کے برعکس کچھ اہلِ ادب کا خیال ہے کہ یہ سبک ہندی کا خاصہ ہے ہم یہاں پر ان کی رائے پر کوئی بحث نہ کریں گے بلکہ اُن کا خیال پیش کر دیں گے۔ رضازادہ شفق لکھتے ہیں۔

"سبک غیر طبیعی دورہ کہ معمول در زمانِ صفویہ بنہایت انحطاط رسید و استعمال ترکیبات غریب و کلمات نامانوس و جناس ہائے تو در تو و نکتہ گوئی ہائے مزیج و نازک کاری و مضمون آفرینی و معانی پیچیدہ با ریک بیشتر رائج گشت مخصوصاً شعرائے مقیم ہند دریں طرز افراط کردند و در نتیجہ سبک متکلف مضمون پرست

مصنوعی، بمیان آمد کہ آنرا برخی سبک ہندی می نامند ولی سبک ہندی در مقابل ایں افراط ہنر نمائی ہم کرد[1]۔"

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے ہم اس رائے پر کوئی تنقیدی نظر نہ ڈالیں گے لیکن یہاں پر یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں ہے کہ جس چیز کو معائب شعری میں شمار کیا جا رہا ہے اس کے برتنے والے صرف ہندوستان کے فارسی گو ہی نہیں ہیں بلکہ اہل ایران بھی ان میں شامل ہیں اور جب کہ دونوں ملکوں کے شعرا کے اس طرز میں اشعار موجود ہیں تو پھر اس طرز کو سبک ہندی کا نام دینا کہاں کا انصاف ہے؟ بہر حال ہمارے فاضل ناقد نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "سبک ہندی در مقابل ایں افراط ہنر نمائی ہم کرد"، انھوں نے جس چیز کو ہنر نمائی کا نام دیا ہے اس کی مثال میں ہم غالب کے مذکورہ بالا اشعار بلا تکلف پیش کر سکتے ہیں ہمارے خیال میں غالب کا یہ کمال ہی سب سے بڑا کمال ہے کہ انھوں نے دماغی شاعری کے باوجود اپنے کلام کو بے نمکی سے بچا لیا ہے۔

ابھی تک ہم غالب کے جس طرح کے اشعار سے بحث کر رہے تھے وہ ان کی پوری شاعری کے ترجمان نہیں بلکہ صرف اس کے ایک رخ کے ترجمان ہیں۔ اب دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو۔ مرزا غالب اپنی شاعری کے بارے میں، خاتمہ دیوان فارسی میں لکھتے ہیں۔

"شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی راہروی ہائے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادہ آں ہرزہ جنبش ہائے نارو ادر پائی رہ پیمای من سوخت، ظہوری بسر گرمی گیرائی نفس حرزی بباز وئی و توشہ بکمر بست، نظیری لاابالی خرام بہنجار خاصہ خودم بجا کش آورد۔ اکنوں بہمین فرح پرورش آموختگی ایں گروہ فرشتہ شکوہ کلک رقاص من بخرامش تدرو داست، و بہ رامش موسیقار بجلوۂ طاؤس است[2]۔"

غالب نے حزیں کے جس خندۂ زیر لبی، طالب آملی کے غصہ اور عرفی کے غضب کا تذکرہ کیا ہے اس نے ان کی شاعری کو بڑی حد تک سنبھال لیا اور وہ صرف دماغی شاعر نہیں بلکہ دل کے احساسات و جذبات کے بھی ترجمان بننے کی کوشش میں لگ گئے ان کی اس کوشش سے ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ اور آہنگ آیا اور ان کے نغمات سے ساز دل کی جھنکار سنائی دینے لگی، نظیری، عرفی، ظہوری اور حزیں نے جس طرح سے شاعری کے ذریعہ اپنی اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کی سعی کی ہے۔ غالب وہاں تک تو نہ پہونچ سکے لیکن اس کے باوجود ان کے کلام

---

[1] تاریخ ادبیات ایران، رضا زادۂ شفق، ۱۱۴ و ۲۱۴۔
[2] کلیات نثر غالب ص۔ ۶۸ مطبوعہ نولکشور پریس سنہ ندارد)

میں اس رنگ کی بھی پرچھائیاں پڑنے لگیں جس کی وجہ سے ان کی دماغی شاعری ایک دوسرے کیف اور ایک دوسرے رنگ کی حامل ہوگئی۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں اس لیے ہم یہاں پر اُن کے چند اشعار نمونہ کے طور پر درج کرتے ہیں،

بجوز شمار وفاہائی من ز مردم پرس
بمن حساب جفاہای خویشتن یاد آر

درین روش بچہ امید دل توان بستن
میانۂ من و او شوق حائل افتاد ست

نگفتہ داریم و با یاران نمی گوئیم فاش
طالب دیدار باید تاب دیدار آورد

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم
بکوچہ بر سر رہ پاسبان بگمردانیم

نامرادم دار دای افزونی خواہش بدہر
آب من لیستہ اند آری ز استغنای من

ہرگونہ حسرتی کہ ز ایام می کشیم
ز دترِ پیالۂ اُمید بودہ است

آوارۂ غربت نتوان دید صنم را
باشد کہ دگر تنگ بسازند حرم را

منم کہ با جگر تشنہ می نوردم راہ
بوادیی کہ خضر کوزہ و عصا انداخت

طور بتجلی طور بنود گرچہ در خرگاہ خویش
ہر کس افروزد چراغی چون شب تاری رسد

سر از حجاب تعین اگر برون آید
چہ جلوہ ہا کہ بہر کنشش می توان کردن

ہائے پرکاری ساقی کہ بارباب نظر
می باندازہ و پیمانہ باندازہ دہد

عیش و غم در دل نمی استد خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکسانست در غربال ما

نفس گداختگی ہای شوق را نازم
چہ شمعہا بسرا پردۂ بہانم سوخت

تماشای رخ ما کہ بدعوی نشستہ ایم
در خلوتی کہ ذوق تماشا شود ہلاک

تا بچہ مایہ سر کنیم نالہ بلند ربی غمی
از نفس انچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم

در غمش عمری بسر بردم ز دعوی شرم نیست
فرصت کو کز دعائی خود خبردارش کنم

بجرم این کہ در مستی بپایان بردہ ام عمری
بکوی میفروشان در خمارم می توان کشتن

با دوستان مباحثہ دارم ز سادگی
در باب آشنائی نا آزمودہ

شاد باش ای غم ز بیم مرگ ایمن ساختی
گشت صرفِ زندگانی بود گر شوارئی

ان اشعار کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ نظیری، عرفی، ظہوری، اور حزیں کے رنگِ کلام نے غالب کو بروقت سنبھال لیا اور اُن کے کلام کو چیستاں نہ بننے دیا۔ یہ تو درست ہے کہ اس تبدیلی کے بعد بھی اُن کے اشعار میں کسی قدر پیچیدگی باقی رہی اور وہ بعید از فہم استعارات و کنایات سے بھی کام لیتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے جو انداز بیان اختیار کیا وہ بھی عام فہم یا عام شعرا کے انداز بیان سے بہت میل نہیں کھاتا پھر بھی اس رنگ

کلام کی آمیزش نے اُن کے مجموعۂ اشعار کو اُن لوگوں کے لیے بھی جاذب نظر بنا دیا جو دماغی شاعری کے متحمل نہیں ہو پاتے۔ غالبؔ کی دل کی شاعری بھی اُن کے دماغ کی تابع ہے اسی وجہ سے اُن کے یہاں وہ گہرا جذباتی رنگ نہیں ملتا۔ جو شفائیؔ، وحشیؔ، شرف قزوینی وغیرہ کا خاصہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مذکورہ شعرا شاعری کو شخصیت کے ترجمان کی حیثیت سے برتتے تھے۔ اور غالبؔ نے شاعری کو صرف ایک فن سمجھ کر برتا اس کے علاوہ ایک اور وجہ ہو سکتی ہے۔ غالبؔ جس ماحول میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے وہ سخت انتشار کا دور تھا جب تک مغلیہ حکومت قائم رہی پورا ملک ایک شدید افراتفری میں مبتلا رہا پھر ۱۸۵۷ء میں غدر کا ہنگامہ ہوا جس نے اقدار کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ سے ہلا کر رکھ دی اس کے بعد انگریزوں کا دور شروع ہوا اور جب ان کی حکومت کو استحکام نصیب ہوا تو ہندوستان کو نظر آیا کہ زمین و آسمان بدل چکے ہیں۔ ہر چیز ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے اور ہر قدر کے بطن سے نئی نئی قدریں جنم لے رہی ہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں قدروں کو بھی استحکام نہ نصیب ہو جذباتی شاعری ہو بھی کیسے سکتی تھی؟ اس لیے غالبؔ کا طائر فکر تخیل کی وادی کی سیر میں مصروف ہو کر نوا پیرا ہوا اور جب اس کی نوا پیرائی میں دل کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ تب بھی تخیل کی دنیا کا رنگ اس کے لئے پر اتنا گہرا چڑھ چکا تھا۔ کہ اس کے دل کے جذبات اس کی نوا پیرائی میں بہت کم جھلک پائے ایک زوال پذیر دور کا شاعر اس سے زیادہ حکایت دل بیان بھی کیا کر سکتا تھا؟ غرض کہ غالبؔ کی شاعری جن دو رنگ کلام سے مل کر بنی ہے اِن میں دماغی یا تخیلی رنگ بہت گہرا ہے جو یقیناً کسی بڑے دماغ ہی کی کاوش کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ہمارا خیال ہے کہ غالبؔ کی فارسی غزل ایک ایسے بڑے دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جو روز روز پیدا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر سید وحید اشرف

مثنوی ابرِ گہربار کا تنقیدی مطالعہ

حالیؔ نے یادگار غالب میں غالب کو قصیدے میں انوریؔ و خاقانی کا ہم پلہ، رباعی میں عمر خیام کا ہم آواز اور غزل میں عرفیؔ سے بڑھ کر قرار دیا ہے۔ حالیؔ کی یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں۔ البتہ اسی کتاب میں حالی کی اس رائے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ خسرو اور فیضی کے بعد لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا غالب جیسا جامع صفات آدمی آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اُٹھا۔

مرزا غالب کو قصیدہ نگاری میں انوری اور خاقانی کا ہمسر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اُن کی رباعیاں بھی عمر خیام کی رباعیوں کے مقابلہ میں بہت کمتر درجہ کی ہیں۔ غزل میں حافظ کا کوئی جواب نہیں ہو سکا اور مثنوی میں فردوسی اور نظامی کے مقام کو کوئی نہ پا سکا۔ لیکن نظامی اگر مثنوی کے استاد ہیں تو دوسرے اصناف سخن میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ عمر خیام کا تمام سرمایہ شاعری صرف اس کی رباعیات ہیں۔ حافظ کا میدان صرف غزل ہے انوری اور خاقانی کے طرۂ امتیاز ان کے قصائد ہیں۔ عرفی غزل اور قصیدہ میں کامیاب ہے۔ لیکن اس سے مثنوی نہ بن پڑی۔ اس کے برخلاف غالب کی شخصیت جامع صفات ہے۔ اس نے جس صنف سخن کو ہاتھ لگایا اس میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اُس نے غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ سب کچھ لکھا اور کسی کو معیار سے گرنے نہ دیا۔ مثنوی کی طرف کم توجہ کی۔ لیکن اس صنف میں بھی جو کچھ لکھا اس میں "غالبیت" نمایاں ہے۔

ایران میں جامع ترین ادبی شخصیت سعدی کی ہے۔ حالانکہ شبلی کے الفاظ میں غزل میں جو زمین انھوں نے ہموار کی تھی حافظ نے اسے آسمان بنا دیا، مثنوی اور قصیدہ نگاری میں بھی اگرچہ وہ اعلیٰ درجہ کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن اس میدان کے مرد یکتا نہیں۔ البتہ نثر میں گلستاں ہے۔ جس کی بے مثلی آج تک برقرار ہے۔ اگر مرزا کے بھی اردو اور فارسی کے تمام کارناموں کو یکجا کیا جائے تو اردو نثر میں وہ

ایک طرز کے موجد اور اُردو غزل میں ان کی بے مثلی برقرار ہے اور اگر بحیثیت مجموعی غالب کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ انگلینڈ کو جس طرح شکسپیر پر ناز ہے اور ایران کو جس طرح سعدی پر فخر ہے۔ اسی طرح ہندوستان بھی بجا طور پر غالب کی شخصیت پر فخر کر سکتا ہے۔

مرزا کے اُردو اور فارسی دیوان کو یکجا کرنے پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے عمر کا بیشتر حصہ غزل گوئی پر صرف کیا ہے اور ہر وہ شخص جو اُردو فارسی کے مزاج سے آشنا ہے اور طبع موزون بھی رکھتا ہے۔ جانتا ہے کہ تمام اصنافِ سخن میں مشکل ترین فنِ غزل ہے۔ مرزا کی یہ مشکل پسندی ہی تھی جس نے انھیں "غالب" بنا دیا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بقول مولانا حالی مرزا کے نزدیک شاعری کا اصلی معیار قصیدہ تھا۔ دوسرے اسباب کے ساتھ غالباً یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ مثنوی کی طرف مرزا نے برائے نام التفات کیا اور قصیدہ کی طرف خصوصی توجہ کی۔ مرزا کے فارسی کلیات میں قصائد کے اشعار کی تعداد اگر غزل کے اشعار کی تعداد سے زیادہ نہ ہو تو کم بھی نہیں معلوم ہوتی۔ مرزا کا یہ نقطۂ نظر صحیح نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ قصیدے ہی کے بطن سے غزل وجود میں آئی ہے لیکن مرزا کے زمانہ سے صدیوں پہلے غزل اپنی معنویت، مزاج اور وسعت کے اعتبار سے قصیدے سے ایک علیٰحدہ صنف بن چکی تھی۔ لیکن مثنوی کی طرف خاص توجہ نہ دینے کا سبب مرزا کے اس نقطۂ نظر کے علاوہ اور بھی اسباب وقت کے سیاسی حالات، سماجی کیفیت اور روایتی پس منظر میں ملیں گے۔ جن کی تفصیل میں ہم اس وقت نہیں جانا چاہتے۔

مرزا کی مثنویوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں طویل نظم لکھنے پر بھی پوری قدرت تھی اور اگر وہ بجائے قصیدہ کے مثنوی کو زیادہ اہمیت دیتے تو ان کی شخصیت زیادہ اُبھر کر سامنے آتی۔ اُردو اور فارسی کے عظیم اور مفکر شعرا اپنی طویل نظموں خصوصاً مثنوی کے ذریعہ اپنی شخصیت کی بھرپور وضاحت کر سکتے ہیں۔ مولانا روم کے کمالِ فن کا مظاہرہ ان کی غزلوں سے ہوتا ہے مگر اُن کی شخصیت کی واضح نمائندگی اُن کی مثنوی سے ہوتی ہے۔ حافظ کی شخصیت اپنے تمام فکری سرمائے کے باوجود محض غزل گو ہونے کی بنا پر آج تک متنازعہ فیہ رہی ہے۔ نظامی کوئی غزل گو شاعر نہ تھے۔ اُن کی مثنوی کا موضوع بھی داستان سرائی ہے۔ مگر اُسے انھوں نے اپنے صوفیانہ اور اخلاقی افکار کے اظہار کا بھی ذریعہ بنایا ہے۔ چنانچہ ان کی مثنویوں سے ان کا فلسفۂ اخلاق مرتب کرنا چنداں دشوار نہیں۔ ہندوستان میں اقبال نے بھی اپنے افکار کی وضاحت کا ذریعہ طویل نظموں اور خصوصاً مثنوی کو بنایا۔ مرزا بھی اگرچہ فلسفی نہ تھے مگر ایک مفکر شاعر تھے۔ دیوانِ غالب میں معتد بہ تعداد میں ایسے اشعار ہیں جو زندگی کے گہرے تجربہ اور فکر و شعور کا نتیجہ ہیں۔ یادگارِ غالب سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا اگرچہ دیر گوئی اور بدیہہ گوئی کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

مگر اپنے دیوان میں زیادہ تر انھیں اشعار کو جگہ دی جو بڑی کاوش اور غور و فکر کے بعد کہے گئے تھے۔ تصوّف اور خصوصاً عقیدۂ وحدۃ الوجود اُن کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اُن کی زندگی کے بعض تجربات نے نظریہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جن کا جا بجا اظہار غزلوں میں ہوتا ہے۔ ان افکار کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے مرزا نے مثنوی ہی کا انتخاب کیا تھا لیکن یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔ یہ مثنوی جو ناتمام رہ گئی۔ اسے مرزا نے ابر گہربار کے نام سے موسوم کیا تھا۔

اس مثنوی میں مرزا نے داستان سرائی سے ہٹ کر غزوات اور سوانح رسول اکرم ؐ کو نظم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض واقعہ نگاری مرزا کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ مثنوی ناتمام سے جو ابر گہربار کا صرف تمہیدی حصہ ہے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی اگر مکمل ہو جاتی تو مرزا کے نظریات اور فلسفیانہ افکار کی زیادہ واضح نمائندگی کرتی۔

مثنوی ناتمام پر نظامی گنجوی کا اثر نمایاں ہے۔ اور معراج کے بیان میں تو نظامی کی آواز بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مرزا نے نظامی کی محض تقلید کی ہے۔ بلکہ اُن کے یہاں ایسے فکری عناصر اور وہ فنی رچاؤ بھی موجود ہے جو ایک اوّل درجہ کے شاعر کے کلام میں ہونا چاہیے۔ یوں تو غالب کا مقابلہ نظامی سے کرنا درست نہیں کیوں کہ نظامی نے متعدد مکمل اور طویل مثنویاں لکھیں اس کے برعکس غالب کی مثنوی ناتمام ایک مثنوی کی محض تمہید ہے اس لیے غالب کو اپنے قلم کی پوری جولانی اور تنوع فکر کے اظہار کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن مرزا نے خود کئی جگہ نظامی کا نام لیا ہے اور مثنوی میں اپنا مقابلہ نظامی سے کیا ہے۔ مثلاً

نظامی نیم کز خضر در خیال	بیاموزم آئینِ سحر حلال
نظامی کشتہ ناز تا بم کجا	زلالی بود خفتہ خوابم کجا

ایک اور مثنوی میں لکھتے ہیں۔

گرچہ بہ از نظم نظامی ست ایں	مدح مخوان خط غلامی ست ایں

اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی ناتمام کا مطالعہ نظامی کی مثنویوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے اس طرح مثنوی میں غالب کی تخلیقی صلاحیت اور اس کے فکر و فن کا جوہر زیادہ نمایاں ہو سکے گا۔ بلکہ نظامی کو نظر انداز کر کے غالب کی مثنوی کا مطالعہ بھی ناقص رہے گا۔

غالب کی شاعری اور خصوصاً اس کی مثنوی کا مقام متعین کرتے وقت اس کے دور، اس کی زندگی، شعراء کی عام روش اور ان سیاسی اور سماجی حالات کو جو مشرقی شاعری کا پس منظر رہے ہیں پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

غالب نے مثنوی لکھنا اس وقت شروع کیا جب کہ طبیعت کی جولانی رو بزوال تھی۔ خود لکھتے ہیں ؎

کنونم کہ بسر شور گفتار نیست	بساز غزل زخمہ بر تار نیست
سخن را خود آن گونہ دانم سرود	کزیں نیز خوشتر توانم سرود
ولی تاب در خود نیابم کنون	صریر قلم بر نتابم کنون
دریغا کہ در دانش گفتگوی	بہ پیری خود آرائی آورد روی

گویا غالب مثنوی لکھنے کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب وہ جذبۂ شاعری باقی نہ رہا جو غزل لکھنے کے دور میں تھا۔ اس کے برعکس نظامی کی زندگی کے پچیس چھبیس سال صرف مثنوی نگاری میں صرف ہوئے۔ نظامی نے مثنوی میں عشقیہ شاعری میں خوب داد سخن دی ہے۔ لیکن غزل میں اُن کا فن جواب دے جاتا ہے۔ نظامی کے وقت میں ایسے شاہان قدردان موجود تھے جو انھیں سخن رانی کا صلہ دے سکتے تھے۔ ان انعامات کا ذکر نظامی نے اپنی مثنوی میں جابجا کیا ہے اور اس پر انبساط و مسرت کیا ہے۔ غالب کا حال یہ تھا کہ اس کا کوئی صحیح قدر دان نہ تھا اپنی مجبوریوں کا ذکر غالب نے بڑے دردناک اور دل گداز انداز میں مثنوی میں کیا ہے۔

غالب اس وقت پیدا ہوئے جب کہ ہندوستان میں فارسی ادب کے زوال کا زمانہ تھا۔ غالب اہل زبان نہ تھے بلکہ مطالعہ اور محنت سے فارسی زبان میں استعداد بہم پہونچائی تھی۔ علاوہ بریں مرزا کے ساتھ بعض اور دشواریاں تھیں۔ جن کا ذکر انھوں نے اپنی مثنوی میں بھی کیا ہے۔ نظامی کا موضوع داستان سرائی تھا۔ غالب نے سیرۃ النبیؐ پر قلم اُٹھایا تھا۔ مرزا کے یہاں طبیعت کو آزادی کا موقعہ نہیں تھا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ اگر یہ پابندی نہ ہوتی تو ہم ہفتخوان بلکہ ہفتاد خواں طے کر لیتا۔

باقبال ایمان و نیروی دین	سخن راندم از سید المرسلینؐ
دریں رہ بسیج سفر با لبیت	بود راست لیکن خطر با لبیت
زبا لغزہا کاندریں رہ بود	بود در دراز ارچہ کوتہ بود
بمستی توان نغز گفتار بود	مرا بایہ از خویش ہشیار بود
ہنر می کہ در وی بود اجتناب	ز رود و سرود و شراب و کباب
سخنور چہ گفتار پیش آورد	کزاں رنگ بر روی خویش آورد
اگر جای داستاں سرائی بدی	رہ و رسم جادو نوائی بدی
زباں را برامش گرو کردمی	دم جنبش زخمہ نو کردمی
ہم زخمہ اندیگران نیز تر	ہم ساز دانش نوا خیز تر

بہ آزادگی خسروی می کنم	بدیں پشت دولت توی میکنم
نباشند اگر پای وین درمیاں	نہم منفخواں بلکہ ہفتاد خواں
پرم از تو پر تر ببال گزاف	تو سیمرغ آری دمن کوہ قاف

ان تمام باتوں کے باوجود مثنوی ناتمام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے اظہار فکر میں پختگی فن کے ساتھ داد سخن دی ہے۔

مثنوی ناتمام چند ذیلی عنوانات میں منقسم ہے۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) حمد (۲) مناجات (۳) نعت (۴) بیان معراج (۵) منقبت (۶) مغنی نامہ (۷) ساقی نامہ۔

نظامی کے کلام میں حمد و مناجات کا حصّہ صفائی بیان اور جذبہ کی شدت کے اعتبار سے ان کی مثنوی کا بہترین حصّہ ہے۔ اگرچہ ان کی جولانی طبع اور شاعرانہ گلکاریاں داستاں سرائی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ صنعت پرستی اور مشکل پسندی نظامی کا خاص وصف ہے اور بقول محمود شیرانی نظامی کے کلام میں موشگافی کے اثر سے شعر بعض اوقات معمّا بن کر رہ جاتا ہے لیکن حمد و مناجات کا حصّہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ نظامی ایک صوفی منش آدمی تھے۔ اگرچہ زمانہ نے اُن کو شاہی درباروں سے وابستہ کر رکھا تھا لیکن درویشی ان کی طبیعت میں واقع ہوئی تھی۔ وہ رند مشرب نہیں بلکہ زاہد پاکباز تھے۔ وہ سراپا نیاز تھے۔ اور ناز و خودی کا سایہ بھی ان پر نہیں پڑ سکتا تھا۔ گریۂ سحری اور شب بیداری ان کا وظیفۂ حیات تھا۔ ایسا زاہد پاکباز سخن طراز خدا کے حضور عرض نیاز کے جو انداز اختیار کر سکتا ہے۔ وہ ایک رند مشرب آزاد شاعر کو کہاں نصیب ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حمد و مناجات کے تحت نظامی کے بعض اشعار سہل ممتنع کے درجہ کو پہونچے ہوئے ہیں اور آج بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

سپردم بتو مایۂ خویش را	تو دانی حساب کم و بیش را
گراییں خاک روی از گنہ تافتی	بآمرش تو کہ رہ یافتی
گناہ من ار نامدی در شمار	ترا نام کی بودی آمرزگار

خدا کی بندگی کا اقرار کرنے والا ہر شخص نظامی کی مناجات کو پڑھ کر احساس بندگی میں اس زاہد شاعر کے ساتھ اپنے کو شریک پائے گا۔

اس کے برعکس غالب خدا کے حضور اس طرح پیش ہوتا ہے کہ اقرار جرم اور اظہار بندگی کے ساتھ خدا سے شکوہ سنج ہوتا ہے۔ گناہوں کی معذرت پیش کرتا ہے۔ دنیا میں اپنی بے کسی و مجبوری کی داستاں سناتا ہے اور اپنی حالت زار کا ایسا دردانگیز نقشہ کھینچتا ہے جسے پڑھنے والا ایک منکر خدا بھی خدائی کا اقرار کرے گا کہ ایک خدا کی بندگی کا اقرار کرنے والا شریف النفس، انسانیت دوست، راستباز، حق پسند اور باکمال انسان جسے دنیا میں کوئی صلہ نہ مل سکا۔

بلکہ اُلٹے آلام روزگار ہی میں گھرا رہا اسے کم از کم مرنے کے بعد تو کوئی صلہ ملنا چاہیئے۔ مثنوی کا یہ حصہ جس میں غالب نے آپ بیتی سنائی ہے نہ صرف مثنوی ناتمام کا بہترین حصہ ہے۔ بلکہ پورے فارسی ادب میں اس کا جواب ملنا مشکل ہے بس یہی غالب کے فخر و امتیاز کے لیے کافی ہے ان اشعار کو یہاں نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا بشتر حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

بروزی کہ مردم شوند انجمن
شود تازہ پیوند جانہا بہ تن

دراں حلقہ من باشم و سینۂ
ز غمہای ایام گنجینۂ

در آب و در آتش بسر بردۂ
ز دشواری زیستن مردۂ

تن از سایۂ خود بہ بیم اندرون
دل از غم بہ پہلو دو نیم اندرون

بسختی بہ برنا کسی ہای من
تہیدست و درماندم وای من

بہ پرسش تو از دمنہ بار من
نسنجیدہ بگذار کردار من

بکردار سنجی میفزای رنج
گرانباری درد عمرم بسنج

اگر دیگراں را بود گفت و کرد
مرا مایۂ عمر رنج ست و درد

چہ پرسی چو آں رنج و درد از تو بود
غمی تازہ در ہر نورد از تو بود

فرو بل کہ حسرت خمیر من است
دم سرد من زمہریر من است

مبادا بگیتی چو من ہیچ کس
جہنمی دل زمہریری نفس

ببیش مرا در ہم افسردہ گیر
پرکاہ را صرصری بردہ گیر

پس آنگہ بدوزخ فرستادہ دان
در آتش خس از باد افتادہ دان

ز دودی کہ برخیزد از سوز من
شود بیش تاریکی روز من

اگر ہمچنیں است فرجام کار
کہ می بایہ از کردہ راندن شمار

مرا نیز یارای گفتار دہ
چو گویم بر آن گفتہ زنہار دہ

درین خستگی پوزش از من مجوی
بود بندۂ خستہ گستاخ گوی

زبان گرچہ من دارم اما ز تست
بہ تست ارچہ گفتارم اما ز تست

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم

نکشتم کسی را بہ ہر سیتی
نبردم ز کس مایہ در رہزنی

مگر می کہ آتش بگیرم از دست
بہ ہنگامہ بیداد ز موزم از دست

من اندوهگین و می اندهربای — چه میکردم ای بنده پرور خدای
حساب می و رامش و رنگ و بوی — ز جمشید و بهرام و پرویز جوی
که از باده تا چهره افروختند — دل دشمن و چشم بد سوختند
نه از من که از تاب می گاه گاه — به ریوزه رخ کرده باشم سیاه
نه بستان سرای نه میخانه ای — نه دستان سرائی نه جانانه ای
نه رقص پری پیکران بر بساط — نه غوغای رامشگران در رباط
شبانگه بمی رهنمونم شدی — سحرگه طلبگار خونم شدی
تمنای معشوق و باده نوش — تقاضای بیهوده میفروش
چه گویم چو هنگام گفتن گذشت — ز عمر گران مایه بر من گذشت
بسا روز باران و شبهای ماه — که بود دست بی می بچشم سیاه
افقها پر از ابر بهمن همی — سفالینه جام من از می تهی
بهاران و من در غم برگ و ساز — در خانه از بینوائی فراز
جهان از گل و لاله پر بوی و رنگ — من و حجره و دامنی زیر سنگ
اگر تافتم رشته گوهر شکست — دگر یافتم باده ساغر شکست
سر از منت ناکسان زیر خاک — لب از خاکبوس خسان چاک چاک
چون آن نامرادی بیاد آیدم — بفردوس هم دل نیاسایدم
صبوحی خورم گر شراب طهور — کجا زهره صبح و جام بلور
دم شب رو و بیهای مستانه کو — بهنگامه غوغای مستانه کو
در آن پاک میخانه بیخروش — چه گنجائی شورش نای و نوش
سیه مستی ابر و باران کجا — خزان چون نباشد بهاران کجا
اگر حور در دل خیالش که چه — غم هجر و ذوق وصالش که چه
چه منت وهد ناشناسا نگار — چه لذت دهد وصل بی انتظار
نظربازی و ذوق دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو
نه چشم آرزومند دلاله — ز دل تشنه کام دیرکاله
ازینها که پیوسته میخواست دل — هنوزم همان حسرت آلاست دل

بہر جرم کز روی دفتر رسد	زمن حسرتی در برابر رسد
بفرمای کاین داوری چون بود	کہ از جرم من حسرت افزون بود
ہر آئینہ ہیچو منی را بہ بند	تلافی فراخور بود نی گزند
بدین موبہ در روز امید و بیم	بگریم بہ انسان کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب را چارہ جوی	تو بخشی بدان گریہ ام آبروی
دگر خون حسرت ہدر کردہ ای	زیاد اش قطع نظر کردہ ٔ
گذشتم ز حسرت امیدیم ہست	سپید آبروی سپیدیم ہست
کہ البتہ این رند ناپارسا	کج اندیشہ گبر مسلماں نما
پرستار فرخندہ منشور تست	ہوادار فرزانہ دستور تست

بہ بند امید استوار ی فرست
بہ غالب خط رستگاری فرست

خدا سے شکوہ سنجی ناشکری اور کم ہمتی کی دلیل ہے۔ اور غالب نے بھی اس کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن اس موقع پر وہ خدا کے سامنے شکایات کا ایک دفتر کھول رہا ہے۔ یہاں بلاغت کا پہلو یہ ہے کہ عدالت میں مجرم کو اپنے جرم کی صفائی میں سب کچھ کہنے کا حق ہے اور مزید براں غالب یہ حق یہ کہہ کر حاصل کر لیتا ہے۔

اگر ہمچنین است فرجام کار	کہ می باید از کردہ دادن شمار
مرا نیز یارای گفتار دہ	چو گویم بہ آن گفتہ زنہار دہ

حمد کے بیان میں بالعموم نظامی کا پایہ بلند ہے اور در اصل یہاں نظامی ہی کی ہموار کی ہوئی زمین پر غالب نے نے چمن آرائی کی ہے اور کہیں ان کے چمنستان خیال سے گل چینی کر کے دیدہ زیب گلدستہ بنایا ہے لیکن اس موضوع پر بھی مرزا ایک خاص فکر کے حامل ہیں جہاں سے ان کی راہ نظامی سے الگ ہو جاتی ہے۔ حمد کے بیان میں غالب کا خاص رنگ نظریہ وحدۃ الوجود کے اظہار میں ملتا ہے۔ یہاں غالب کا انداز بیان زیادہ نکھرا ہوا اور قلم رواں دواں نظر آتا ہے۔

زہی ہستی محض و عین وجود	کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود
گران مایگان عرق کوثر اند	خساں خستہ موج ساغر اند
مناجاتیان پیش وی در نماز	خراباتیان را بدو چشم باز
بہ ہر سو کہ رو آوری سوی اوست	بہ دان رو کہ آوردہ روی اوست

جہان چیست آئینۂ آگہی — فضای نظرگاہ وجہ اللّٰہی

بگردون ز مہر و باختر ز تاب — بدریا ز موج و بگوہر ز آب
بانسان ز نطق و بمرغ از خروش — بناداں ز وہم و بدانا ز ہوش
بچشم از نگاہ و بآہو ز رم — بچنگ از نوای بمطرب ز دم
بباغ از بہار و بشاہ از نگیں — بگیسو ز پیچ و بابرو ز چیں
عیار وجود آشکارا کنی — نشانہای جود آشکارا کنی

نظامی حیرت زدہ ہیں کہ خیال کی تخلیق کہاں سے ہوتی ہے اور کیسے ہوتی ہے وہ سوال کرتے ہیں اور خاموش ہوجاتے ہیں۔ اس کے جواب تک اُن کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی۔ شرفنامہ میں لکھتے ہیں۔

بگو ای سخن کیمیای تو چیست — عیار ترا کیمیا ساز کیست
کہ چندیں نگار از تو برساختند — ہنوز از تو حرفی نپرداختند
اگر خانہ خیزی قرارت کجاست — در از در در آئی دیارت کجاست
ز ما سر برآری و با ما نۂ — نمائی بما نقش پیدا نۂ
عمل خانۂ دل بفرمان تست — زبان خود عمل دار دیوان تست

غالب بھی یہی سوال کرتے ہیں لیکن پھر اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ نظریہ وحدۃ الوجود اس کے جواب تک غالب کی رہنمائی کرتا ہے۔

ندانم کہ پیوند حرف از کجاست — دریں پردہ لحنی شگرف از کجاست
گر از دل شناسم جنوں بیش نیست — کہ آں نیز یک قطرہ خوں بیش نیست
خرد را سگالم کہ نیرو دہد — خود او راز من حیرتی رو دہد
نہ آخر سخن را گشائش ز تست — بہ نابود چندیں نمائش ز تست
چو پیدا تو باشی نہان ہم توئی — اگر پردہ باشد آنہم توئی
بہر پردہ دستانہ کس جز تو نیست — شناسندہ راز کس جز تو نیست
ترا با خود اندر پرند خیال — بود نقطۂ از صفات کمال
کز ان نقطہ خیزد سیاہ و سپید — وز ان پردہ بالد ہراس و امید
بدان تازہ گرود مشام از شمیم — بدان بشگفد گل بباغ از نسیم

از آنجا نگہ روشنائی برد — وز آنجا نفس نغمہ زائی برد
از آن جنبش آید بشوخی بردل — اگر موج رنگست ور موج خوں
اگر سود گوہر بدامن برد — زیان خود گر انگہ بحزمن برد
نہ آلایش کفر و پروا نہ دین — زداغ گمان و فروغ یقین
بہر گونہ پروانش ہست و بود — جمال و جلال تو گیرد نمود

نعت کے بیان میں بھی نظامی کے جذبۂ عقیدت اور قلم کی بوقلمونی نے خوب جوہر دکھائے ہیں لیکن یہاں بھی غالب اور اور نظامی کے فکر میں ایک خاص فرق ہے۔ نظامی نے زیادہ تر مقامِ نبوت اور فضائلِ نبوت سے بحث کی ہے۔ غالب کے پیش نظر سیرت کا عملی پہلو بھی ہے جو انسانیت کے لیے اسوہ ہے۔ غالب کی یہ عقل عملی اس کے اشعار میں ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار ذہن کو زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ غالب کے نعتیہ اشعار کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن مضمون کے اعتبار سے نہایت اہم اور فکر انگیز ہے۔

بہ ستائش گر نازقلم نارسا — بہ کلکش سواد رقم نارسا
دل امید جای زبان دیدگاں — نظر قبلہ گاہ جہاں دیدگان
برفتار صحرا گلستان کنی — بگفتار کافر مسلمان کنی
بدنیا زدین روشنائی دہی — بعقبی از آتش رہائی دہی
بجزی خویش اندوہ گاہ ہمہ — بآمرزش امیدگاہ ہمہ
لب نازنینش گذارش پذیر — جہاں آفرینش سپارش پذیر
بلندی دہ کعبہ بالای او — گرامی کن سجدہ سیمای او
زبت بندگی مردم آزاد کن — جہانی بیک خانہ آباد کن
بمحراب مسجد رخ آرای دمہ — بہ اندیش خویش و دعاگوی غیر
تو گوئی کہ بس دل زدشمن ربا ست — کہ سنگ درش سنگ آہن رباست
جمالش دل افروز روحانیان — خیالش نظر سوز یونانیاں
بدم حرز بازوی افلاکیان — بہ پیوند پیرایۂ خاکیاں
نظر محو حسن خداداد تو — ستم کشتۂ غمزہ داد تو
خراج تو برگنج گلشائیان — نثار تو یاریخ مشائیان
جہان آفرین را گرائش بتو — گنہ بخشش را نمایش بتو

معراج کے بیان میں غالب نے نظامی ہی کی پیروی کی ہے۔ لیکن یہاں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو جدّت فکر اور پیرایۂ بیان کے اعتبار سے لائقِ تحسین ہیں اور کہیں کہیں تو بلندیٔ فکر اور قوتِ تخیل میں مرزا نظامی پر بھی سبقت لے گئے ہیں۔ مثلاً شبِ معراج کی تعریف میں نظامی نے خوب خوب جولانیٔ طبع دکھائی ہے لیکن غالب کا یہ شعر سب پر بھاری ہے۔

شبی دیدہ روشن کن دل فروز
ز اجزای خود سرمۂ چشم روز

براق کی تعریف میں تخیل کی بلند پروازی اس شعر میں ملاحظہ کیجئے۔

بہ سُم گنج قارون نمایاں کناں
بہ دم عقد پروین پریشاں کناں

بُراق کی توصیف میں چند اشعار اور دیکھئے۔

سبک خیزیش خندہ زن بر نسیم
کہ در جنبش انگیزد از گل شمیم

ہم از بادِ صبحی سبک خیز تر
ہم از نکہتِ گل دل آویز تر

قدم تا بر او رنگ ماہش رسید
با کلیل کیواں کلاہش رسید

بہا لید چندان ز بیشی قدر
کہ بی منت مہر گردید بدر

واقعہ نگاری اور حمد و نعت کے عام مضامین سے قطع نظر مثنوی نا تمام کے خاص فکری عناصر کے موضوعات یہ ہیں:۔

(۱) وحدۃ الوجود (۲) خرد (۳) غم

نظریۂ وحدۃ الوجود کوئی نیا فلسفہ نہیں۔ مرزا کوئی صوفی بھی نہ تھے اور نہ ہی فلسفی۔ مرزا نے اس عقیدہ کو تصوف یا فلسفہ کی راہ سے نہیں اپنایا تھا بلکہ قدرت نے وسیع المشربی، قلندری و آزادگی، ایثار و کرم، فراخ حوصلگی، ہمدردی و غمخواری اور وسعت اخلاق مرزا کی طبیعت میں ودیعت کیے تھے جو عقیدۂ وحدۃ الوجود کا لازمی نتیجہ ہیں۔ مرزا اپنی طبیعت کی راہ سے نظری طور پر توحید وجودی کے مقام تک پہونچ گئے اور اپنی شاعری میں اسے فلسفیانہ انداز میں پیش کیا یہاں تک کہ یہ نظریہ ان کی شاعری کا خاص جزو بن گیا۔ اس کے برعکس صوفیہ کو یہ مقام عشق و عرفان سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب عقل کے مقام سے آگے نہ جا سکے۔ جس کا نام مقام عشق ہے۔ اگرچہ غالب کو عشق کی برتری سے انکار نہیں اور درحقیقت وہ بھی عشق ہی کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں۔ لیکن مرزا کے نزدیک یہ عشق بھی خرد ہی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ خدا کے حضور وہ اپنی کوتاہی عقل کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

ہر آئینہ ما را کہ ترد امنیم
ز دیوانگی با خرد دشمنیم

نہ سودای عشق و نہ راہ صواب
نہ در سینہ آتش نہ در دیدہ آب

مرزا غالب اپنے گناہوں اور بد اعمالیوں کو دیوانگی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس دیوانگی کو عقل کی ضد بتانے

اور عشق کو عقل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ عقل کو "فروغ سحرگاہ روحانیاں" کہتے ہیں۔

عشق کی برتری کو تسلیم کرنے کے باوجود غالب نے اسے اپنی مثنوی کا جز نہیں بنایا اس کا فلسفۂ حیات ہی عشق کے بجائے عقل پر مبنی ہے کیوں کہ اس کے نزدیک عشق بھی تو عقل ہی کا نتیجہ ہے۔ غالب نے اس موضوع پر جس نکتہ سنجی سے کام لیا ہے وہ دوسرے شعراء کے یہاں مفقود ہے۔ یوں تو فارسی ادب میں متقدمین سے لے کر متاخرین تک کے یہاں عقل کی اہمیت پر اشعار ملتے ہیں لیکن سب سے پہلے فردوسی نے اسے اپنی مثنوی میں ایک موضوع قرار دیا۔ نظامی کے یہاں بھی اس موضوع پر کہیں کہیں اشعار ملتے ہیں۔ لیکن مرزا باریک بینی اور وسعت نظر میں دونوں پر سبقت لے گئے ہیں فردوسی نے عقل کی ستائش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عقل کے ذریعہ دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی ہے۔ نظامی کا انداز بیان اُن کے اخلاقی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ ہفت پیکر میں لکھتے ہیں۔

خرد است آن کہ زور سد یاری	ہمہ داری اگر خرد داری
ہر کہ داد خرد نداند داد	آدمی صورتست و دیو نہاد
و آن فرشتہ کہ آدمی لقب است	زیر کاند و زیرکی عجب است

نظامی کے یہاں عقل محرک عمل نہیں بنتی۔ نظامی کے نزدیک عقل صرف اس لیے کافی ہے کہ وہ خدا شناسی کا ایک ذریعہ ہے مرزا غالب بھی کہتے ہیں کہ ؎

خدا نا شناسی ز نا بخردی ست

لیکن یہ مفکر شاعر اپنے دائرۂ فکر کو اور وسعت دیتا ہے ایک طرف اس کی نگاہ نظام کائنات پر پڑتی ہے اور دوسری طرف وہ انسان کی فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے اور ہر جگہ اُسے عقل کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ اسی لیے اس کی شاعری میں عقل ایک نظریہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مثنوی ناتمام میں اس نے عقل کی جو صفات بیان کی ہیں اُن سے اس کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کا نظریۂ شاعری بھی معلوم ہوتا ہے اور بعض اشعار میں تو فلسفۂ حیات مضمر ہے۔ ذیل میں چند مثالوں سے ہم اس کے مختلف نقطہ ہائے نظر کی تشریح پیش کرتے ہیں

غالب کائنات اور انسان کی فطرت کا مشاہدہ کرنے کے بعد عقل، خواہش اور فطرت میں ہم آہنگی تلاش کرتا ہے وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ چوں کہ خدا تعالیٰ اپنی اس دنیا کو آباد اور پُر رونق دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے انسان کو پیدا کیا تاکہ وہ اس کی تنگی اور ویرانی کو دور کرتا ہے اور اس کی رونق میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے لیے اس نے انسان کو دو چیزیں عطا کیں۔ ایک آرزو دوسرے عقل۔ آرزو انسان کے اندر جد و جہد کا داعیہ پیدا کرتی ہے۔ آرزو ہی انسان کی تمام سر گرمیوں کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

دریں گونہ گون آرزو خواستن	بود چون ببا لیست آراستن

(چونکہ اس دنیا کو خدا کو آراستہ پیراستہ کرنا مقصود تھا۔ اس لیے اس نے انسان کے اندر طرح طرح کی خواہشات پیدا کردیں) اسی مضمون کو علامہ اقبال نے فلسفیانہ رنگ دے کر طرح طرح سے پھیلایا ہے۔

اور عقل اصول اور ضوابط تلاش کرتی ہے۔

به پیرائش این کهن کارگاه　　　بدانش توان داشتن آئین نگاه

چنانچہ عقل کی کار فرمائی نے یہ ویرانہ پریخانہ نظر آتا ہے۔

ز گنجی که بینش بویرانه ریخت　　　در آفاق طرح پریخانه ریخت

لیکن چوں کہ انسان کی خواہشات لاتنا ہی ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ ایک فرد اپنی تمام خواہشات کی تکمیل کرے۔ اس لیے زندگی کا تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کو اپنی خواہشات کے درجات متعین کرنے چاہئیں اور یہ فیصلہ کرنا عقل ہی کا کام ہے جو اس اصول کی پیروی نہ کرے گا اور بلا سوچے سمجھے خواہشات کا غلام بنا رہے گا اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا ان تمام باتوں کو غالب نے صرف ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔

بچشم یکسر از وگوش تاب　　　گرانمایی خواهش از دو رحساب

یہ شعر اور خصوصاً پہلا مصرع اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اس کی تشریح مختلف طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ گویا کوزہ میں دریا بھر دیا ہے۔

فلسفۂ اخلاق کا اصل الاصول اعتدال کی راہ اختیار کرنا ہے۔ ہر اچھائی دو برائیوں افراط و تفریط کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ عقل ہی ہے جو انسان کو افراط و تفریط سے بچاتی ہے۔ غالب ایک مثال کے ذریعہ کہتا ہے۔

غضب را نشان شجاعت دهد　　　ز خواهش به عفت قناعت دهد

فکر، نظر اور اثر یہ سب عقل کے تابع ہیں، غالب نے صرف ایک شعر میں ان کی تعریف کر دی ہے۔

ز اندیشه دم زد نظر نام یافت　　　بکردار رفت از اثر کام یافت

یعنی عقل جب فکر سے کام لیتی ہے تو اس سے نظریات مترتب ہوتے ہیں اور نظریات کے نتائج ان پر عمل کرنے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

نظریۂ شاعری میں مرزا نظامی کے ہمنوا ہیں۔ نظامی کے نزدیک شعر وہی ہے جو جگر کاوی کے بعد کہا گیا ہو۔

سخن گفتن و بکر جان سفتن است　　　نه هر کس سزای سخن گفتن است

بدین دلفریبی سخن های بکر　　　نشستی توان زادن از راه فکر

(شرفنامه)

بر صفت شمع بر افگنده باش　　　روز فرو مرده و شب زنده باش

به که سخن دیر پسند آوری　　　تا سخن از دست بلند آوری

(مخزن اسرار)

غالب کے نزدیک کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس میں عقل کی آمیزش کس قدر ہے۔

بدانش توان پاس دام داشتن　　شمار خم آز قلم داشتن
ازین بادہ ہر کس کہ سرمست تر　　بافشاندن گنج تر دست تر

غالب کو غم بھی اسی لیے عزیز ہے کہ اس کے نزدیک خرد و غم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شب غم سے خرد کا فروغ ہوتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں اور اس کی پُر پیچ راہیں انسان کو زندگی کے گہرے حقائق سے روشناس کراتی ہیں۔ غالب کے ذاتی تجربات و مشاہدات اس کے گہرے احساس کا پتہ دیتے ہیں۔ غم اس کا سرمایۂ حیات ہے۔ جس سے اُس نے خود آگاہی کا مرتبہ حاصل کیا ہے۔ اس کی دل گداختگی اس کے کلام کو زیادہ موثر بنا دیتی ہے۔ اپنے اس متاع حیات پر اس کو ناز ہے۔ اسی لیے اظہار غم میں بھی اس کے یہاں اضطراب نہیں بلکہ ایک شان تمکنت ہے اس کے جذبات میں نہ تندی ہے نہ اضطرار اور نہ شکست خوردگی کا احساس اس کے یہاں کسی حال میں بھی زندگی سے فرار نہیں ہے بلکہ وہ اس کے ہر چیلنج کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مسعود سعد سلمان اور خاقانی کے قصائد بھی ان کی داخلی کیفیات کے مظہر ہیں۔ اظہار غم میں دونوں نے اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن دونوں کے جذبات فرد کے جذبات معلوم ہوتے ہیں جو موثر ہیں اور پڑھنے والے کے دل میں جذبۂ ہمدردی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن دونوں ہی اپنی آپ بیتی میں دوسروں کو شریک نہیں کرتے۔ نظامی بھی کبھی کبھی اظہار غم کرتے ہیں اور داد فن بھی دیتے ہیں لیکن وہ بھی اپنے احساس میں اپنے پیش رووں سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس ضمن میں نظامی کے یہ اشعار ان کے احساس کی غالباً بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔

چہ افتادای سپہر لاجوردی　　کہ امشب چون دگر شبہا نگردی
نہ زین ظلمت ہمی یابم امانی　　نہ از نور سحر بینیم نشانی
شبا امشب جوانمردی بیاموز　　مرا یا زود کش یا زود شو روز
چہ ابر جای ماندی چوں سیہ تیغ　　بہ آتش میردی یا بر سر تیغ
من آں شمعم کہ در شب زندہ داری　　ہمہ شب میکنم چوں شمع زاری
بخواں ای مرغ اگر داری زبانی　　بخند ای صبح اگر داری دہانی
اگر کافرنہ ای ای مرغ شبگیر　　چہ ابرنادری آواز تکبیر

مگر غالب احساس غم میں ان تینوں سے الگ ہے۔ اس کا تصور غم احساس خودی کو نشوونما اور زندگی کو توانائی دیتا ہے اسی لیے وہ اپنے احساس میں دوسروں کو شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

بدانش غم آموزگار من است　　خزاں عزیزاں بہار من است

غمی کز ازل در سرشت من است
بود دوزخ اما بہشت من است

بغم خوشدلم غمگسارم غم است
بہ جیبہ نشتی پردہ دارم غم است

زمین جوی در رہ نگوز زیستن
جگر دردن و تازہ روز زیستن

درشتی بنرمی زبون داشتن
رسد گر ستم غمزہ پنداشتن

بعجز از درون سو جگر سوختن
نیاز از بہ دل سوز رخ افروختن

سخن چیدن و در رہ انداختن
دل افشردن و در چہ انداختن

برفتن سر از پای نشناختن
بماندن تن از جای نشناختن

بدین جادہ کاندیشہ پیمودہ است
غم فکر راہ سخن بودہ است

چراغی کہ بی روغن افروختم
دلی بود کز تاب غم سوختم

ز تیر دان غم آمد دل افروز من
چراغ شب و اختر روز من

نشاید کہ من شکوہ سنجم ز غم
خرد رنجہ از من چو رنجم ز غم

غم دل ز من مرحبا جوی باد
دلم زار و لب مرحبا گوی باد

دلم ہیچہ غالب بغم شاد باد
بدین گنج ویرانہ آباد باد

غالب کو اپنے متاعِ غم پر اس قدر ناز ہے کہ وہ اپنے کو نظامی پر فوقیت دیتا ہے کیوں کہ وہ اس متاع سے خالی ہیں اس کے کلام میں خونِ جگر کی آمیزش ہے۔ وہ جو کہتا ہے اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس نے اپنے دلِ دردمند سے نوائے غزل بلند کی اور اُسے ایک بلند مقام تک پہونچا دیا۔ اسے غم اس لیے عزیز ہے کہ اس نے اسے ایسا غزل سرا بنا دیا اور نظامی صرف خیالی دنیا میں رہتے ہیں اسی لیے وہ غزل میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

نظامی نیم کز خضر در خیال
بیاموزم آئین سحرِ حلال

نظامی کشہ ناز تا ہم کجا
زلالی بود خفتہ اعجم کجا

نظامی بحرف از سروش آمدہ
زلالی از و در خروش آمدہ

من از خویشتن با دلِ دردمند
نوای غزل سر کشیدہ بلند

غزل را چو از من نوای رسید
زوالا پیچی بجامی رسید

کہ شگفت کایین خسروانی سرود
شود وحی و ہم بر من آید فرود

نباشم گر از گنجہ گنجم بس است
بغم گر چنین پردہ سنجم بس است

مثنوی ناتمام کے اس فکری تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظامی کا اثر قبول کرنے کے باوجود غالب اپنی مخصوص فکر میں مقلد نہیں بلکہ مجتہد ہے۔ اس کا فکری سرمایہ خود اس کی زندگی اور ذاتی تجربات کا رہین منت ہے۔ اور اسی میں اس کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

غالب کی فکر میں اس کے فن کی اسی طرح آمیزش ہے جیسے اس کی فکر میں احساس کی گہرائی۔ مرزا کے کلام میں ان کے فکر و فن کا مظاہرہ غزل کے بعد مثنوی میں ہوتا ہے اور اگر مثنوی ابر گہربار مکمل ہو جاتی تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کا سرمایۂ افتخار مثنوی ہوتی اور یہی ان کی شہرت کا اصل سبب بنتی، یہی نہیں بلکہ مرزا کی یہ مثنوی فارسی شاعری میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ کرتی اور خود ان کی شخصیت پوری تابناکی کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ زمانہ کی ناقدری نے انھیں اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ مثنوی ابر گہربار مرزا نے صرف اپنے ذوق کی تسکین کیلئے لکھنا شروع کی جس کی طرف چشم زمانہ سے حسن نظر کی بھی توقع نہ تھی۔ مرزا کے جوش طبیعت پر تعقل کی بالادستی ان کے کلام کو جو متانت و جزالت عطا کرتی ہے وہ مثنوی میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ قصیدے میں جوش طبیعت دکھانے کی کوشش کے باوجود عرفی کا زور بیان نہ پیدا ہو سکا۔ لیکن انھیں موضوعات پر جب مرزا مثنوی میں قلم اٹھاتے ہیں تو بلندی فکر اور نظر کی گہرائی لب و لہجہ میں وہ تمکنت پیدا کر دیتی ہے جس کا طبیعت پر ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ توحید، نعت اور منقبت کے موضوعات پر مرزا نے قصائد بھی لکھے ہیں اور مثنوی میں بھی ان موضوعات پر اشعار ہیں۔ دونوں میں کلام کا فرق نمایاں ہے اور پڑھنے والے کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ مرزا کا اصل میدان قصیدہ نہیں بلکہ مثنوی ہے۔ توحید اور نعت کے موضوعات پر مثنوی کے کچھ اشعار ہم نقل کر چکے ہیں جن سے مرزا کے اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔ منقبت میں ایک قصیدے میں مرزا نے بڑا زور باندھنے کی کوشش کی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

خواہم کہ ہیچ نالہ ز دل سر بر آورم   دود از خود و شرارہ ز آذر بر آورم

لیکن مدح میں وہ اثر نہیں پیدا کر سکے ہیں جو اسی موضوع پر مثنوی کے اشعار میں ہے۔ قصیدے کے اشعار بخوف طوالت ہم یہاں نقل نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ مثنوی کے مدحیہ اشعار یہاں پیش کر دینا مناسب نہ ہوگا۔ ان اشعار میں حضرت علیؓ کی ولایت اور روحانیت، فیاضی و شجاعت، فقر و درویشی، قناعت و ضبط نفس، سادگی و حسن خلق، زہد و عبادت، علم و علو مرتبت کا ذکر کیا ہے۔

بہ تن بخش افروز آفاقیاں   بدم دانش آموز اشراقیاں

بکثرت ز توحید پیوند بخش   بہ بی برگ نخل برومند بخش

بسائل ز خواہش فزوں تر سپار   بلب تشنہ جرعۂ کوثر سپار

نوید ظفر گردی از لشکرش — حساب نظر فردی از دفترش
گدا زغمش کیمیای سرشت — غبار رہش سیمیای بہشت
نگہ کوثر آشامد از روی او — روان تازہ در گرد از بوی او
زمین و فلک در گذرگاہ او — غبار سحر خیزی آہ او
بدر ویشیش فر شاہنشہی — زہی خاکساری و ظل اللٰہی
ہوا و ہوس گشتہ فرمان پذیر — بفرمان روائی حصیرش سریر
خرد زلہ خوارش ز فرزانگی — قضا چنیں کارش بمردانگی
نہانش بیاد آوری دلکشا است — عیانش بری نام مشکل کشاست
براہیم خوی سلیمان فری — مسیحا دمی مصطفیٰ گوہری
لباس وفا را طراز عمل — جہاں کرم را صباح ازل
نہادش بخلق خدا مہر خیز — جبینش بدرگاہ حق سجدہ ریز
نوید نجات اسیرانِ غم — نظرگاہ احرامیانِ حرم
روان و خرد گردی از راہ او — نہ ایزد ولی کعبہ درگاہ او
نبی را جگر تشنۂ روی او — خدا را بخواہش نظر سوی او

متانت و جزالت، ایجاز و استحکام، جدت تراکیب اور اثر آفرینی غالب کی مثنوی کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اس مضمون میں جو اشعار پیش کئے گئے ہیں اُن سے ان اوصاف کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ گذشتہ اوراق میں غالب کے چند اشعار کی وضاحت بھی کی گئی ہے جن سے اس کی بلندیٔ فکر اور مہارت فن کا پتہ چلتا ہے۔ چند اشعار یہاں اور ملاحظہ کیجئے۔

مگر می کہ آتش بگورم ازوست — بہنگامہ پروازِ مورم ازوست
من اندوہگیں و می اندہ ربای — چہ می کردم ای بندہ پرور خدای

غالب خدا سے کہتا ہے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ سوا اس کے کہ شراب پیتا ہوں جس سے میرے تنِ مردہ میں جان آجاتی ہے اور مجھے ذرا دیر کے لیے پروازِ مور حاصل ہو جاتی ہے حالی اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور امنگ پیدا ہو جاتی ہے اس کو پروازِ مور سے بہتر کسی استعارے میں نہیں ادا کیا جاسکتا کیونکہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اس کی موت کی علامت ہے۔ اسی طرح نشۂ شراب کا عارضی نشاط آخر کار موت کی علامت ہوتا ہے

شبلی نے نظامی کے کلام کی بلاغت کے مثال میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

چوں عنوان نامہ عالم تاب را دید | تو گوئی سنگ گنہ بیدہ آب را دید

بیشک نظامی کا یہ شعر اپنے مقام پر منتہائے بلاغت تک پہونچا ہوا ہے۔ لیکن غالب کا مذکورہ شعر بھی اپنی جگہ پر انتہائی بلیغ ہے۔

حمد کے بیان میں مرزا لکھتے ہیں۔

مناجاتیاں پیش وے در نماز | خرابا تیاں را بدو چشم باز

"بدو چشم باز" سے امید و بیم کی جو کیفیت ظاہر کی گئی ہے اسے صفحوں میں بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔

رسولِ اکرم کے امّی ہونے کو کیا اچھوتے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

بہ بستن گشا د قلم نارسا | بکلکش سواد رقم نارسا

اس نازک مرحلہ سے غالب کا ذہن رسا ہی اس آسانی اور صفائی سے گذر سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھوں تک گشادِ قلم کی رسائی ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی آپ کے علم کے اظہار کے لیے کوئی واسطہ متحمل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا آپ کا علم صرف آپ کی زبان ہی ادا کر سکتی تھی۔ اس بیان سے جہاں رسول اکرم کا امّی ہونا ظاہر ہوتا ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علم میں آپ کے علوِ مرتبت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

نظامی توحید کے بیان میں لکھتے ہیں۔

با ہمہ زیر کی کہ در خرد است | بی خود است از تو و بجای خود است

نظامی کا دوسرا مصرعہ چست نہیں ہے کیونکہ یا تو واوِ عطف کا استعمال برمحل نہیں ہے اور یا "بجای خود" کا استعمال بلاغت سے گرا ہوا ہے۔ اس مصرعہ میں ذرا سی ترمیم کے بعد غالب نے اسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔

ہمتی خرد رہنمای خود است | رہ دگر نہ خود و ہم بجای خود است

دونوں شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عقل کی انتہا حیرت ہے فرق یہ ہے کہ نظامی کا شعر عقل کی تنقیص میں ہے اور غالب کا شعر توصیف میں لیکن غالب کے شعر میں "بجای خود" کا استعمال برمحل اور بلیغ ہے اور اس سے جو کام غالب لے سکے ہیں نظامی نہیں لے سکے۔

اس خیال کو کہ "سخن" سے انسان زندہ جاوید بن جاتا ہے۔ نظامی نے طرح طرح سے ادا کیا ہے۔ ہفت پیکر میں لکھتے ہیں۔

ہنگر از ہرچہ آفریدی خدای | تا از و جز سخن چہ ماند بجای
یادگاری کز آدمی زاد است | سخن است آں ہمہ دگر باد است

غالب نے اسے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے۔

بدیں جنبش از مرگ بخشد نجات
بہ اندیشہ بخشد آب حیات

یعنی عقل نکتہ کو آب حیات عطا کرتی ہے۔

شب معراج میں غالب اور نظامی دونوں نے دیدار خدا کا ذکر کیا ہے اور اگرچہ اساس فکر نظامی ہی نے قائم کی ہے لیکن غالب کا انداز بیان ایجاز و استحکام میں ممتاز ہے۔ ذیل کے اشعار میں یہ فرق ملاحظہ کیجئے۔

غالب	نظامی
۱- جہت را دم خود نمائی نماند زمان و مکان را روائی نماند	۱- ہمہ دیدہ گشتہ چو نرگس تنش نگشتہ یکی خار پیرامنش
۲- غبار نظر شد ز رہ ناپدید سراپای بتندہ شد جملہ دید	۲- کلامی کہ بی آلت آمد شنید لقائی کہ آن دیدنی بود دید (شرف نامہ)
۳- تماشا ہلاک جمال بسیط فروغ نظر موجۂ زال بسیط (یعنی فروغ نظر جمال بسیط کے سمندر کی ایک موج تھی اور وہ اس طرح کہ پہلے نظر خود جمال بسیط میں فنا ہو چکی تھی)	۳- دیدہ معبود خویش را بدرست دیدہ از ہر چہ غیر بود بشست ۴- از نبی جز نفس نبود آنجا ہمہ حق بود و کس نبود آنجا (ہفت پیکر)
۴- ز گفتن شنیدن جدائی نداشت نمودن ز دیدن جدائی نداشت	۵- تن بگہر خانۂ اصلی شتافت دیدہ چنان شد کہ خیالش نیافت ۶- دیدن او بی عرض و جوہر است کز عرض و جوہر از آن سوتر است (مخزن اسرار)

ذیل کے اشعار میں غالب کی استعمال کردہ تراکیب سے ایک ایک شعر گنجینۂ معانی بن گیا ہے۔

بچشم سکندر از دو گوش تاب — گر اپنای خواہش از دو حباب (عقل)
نہ نفش توان پاس دم داشتن — شمار خرام قلم داشتن (عقل)

فروغ سحرگاہ روحانیان	چراغ شبستان یونانیان	(عقل)
گرانمایگان غرق کوثر از و	خسان خستۂ موج ساغر از و	(توحید)
جہان چیست آئینۂ آگہی	فضای نظرگاہ وجہ الٰہی	(توحید)
نظر محو حسن خدا داد تو	ستم کشتۂ غمزۂ داد تو	(نعت)

یہ ایک تجزیہ ہے مثنوی ناتمام ہیں غالب کے فکر و فن کا۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ غالب کا نظامی سے مقابلہ کا مقصد غالب کی برتری ظاہر کرنا نہیں ہے۔ نظامی کے دور سے غالب کے دور تک فارسی زبان و ادب ترقی و عروج کے بہت سے مدارج طے کر چکی تھی۔ نظامی کا فیضان تو بڑے بڑے اہل زبان شعرا پر ہے۔ انھوں نے مثنوی میں نئی راہ پیدا کی جس پر ان کے بعد آنے والوں نے چلنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے مضامین اور خیالات سے زبان و ادب کو وسعت بخشی اور دراصل وہ غالب کے بھی معلم اوّل ہیں۔ علاوہ بریں نظامی کا اصل میدان کچھ اور ہے۔ اس لیے اس مضمون سے نظامی کے فن کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم یہ بات ضرور سامنے آجاتی ہے کہ غالب بھی اپنی جولانگاہ میں توسن فکر کے شہسوار ہیں اور اگر مثنوی ابر گہر بار مکمل ہو جاتی۔ تو اس سے فارسی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا۔

نوٹ:۔ مضمون کی ابتدا میں حالی کی اس رائے سے اتفاق ظاہر کیا گیا ہے کہ خسرو اور فیضی کے بعد لٹریری قابلیت میں غالب جیسا جامع صفات کوئی شخص ہندوستان کی خاک سے آج تک نہیں اٹھا راقم الحروف کی رائے میں حالی نے لفظ "لٹریری قابلیت" کا استعمال صحیح نہیں کیا ہے۔ اسے "تخلیقی صلاحیت" ہونا چاہیے۔ لیکن حالی کی رائے سے اس لیے اختلاف نہیں کیا گیا کہ سیاق و سباق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی مراد بھی تخلیقی صلاحیت ہی ہے۔

جناب رحیم علی الھاشمی

لکھنؤ کی شاعری پر غالبؔ کا اثر

انتزاعِ سلطنت مغلیہ کے بعد دلی کا گہوارۂ علم وفن منتشر ہو گیا۔ سلطنت مغلیہ جو کبھی افغانستان سے آسام تک اور کشمیر سے کرناٹک تک پھیلی ہوئی تھی، سمٹتے سمٹتے دلی کے لال قلعہ کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔ آخری مغل "شہنشاہ" بہادر شاہ ظفر انگریزوں کا پنشن خوار تھا اور بعض اوقات روزمرہ کی ضروریات کے لیے اسے انگریز گورنر جنرل کا دست نگر ہونا پڑتا تھا اس لیے یہاں علم وفن کی ہمت افزائی اور قدر شناسی کا سوتا خشک ہو گیا تھا۔ بہادر شاہ کے دربار میں مشاعرے ہوتے تھے، شعروشاعری کا چرچا تھا، اچھے شعروں پر واہ واہ ہوتی تھی اور لمبے چوڑے خطابات بھی دیے جاتے تھے لیکن اہل علم وفن کے سامنے سوال یہ تھا کہ ع

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

دوسری طرف اودھ کی سلطنت میں بھی اگرچہ حکم انگریز ریزیڈنٹ (صاحب کلاں بہادر) ہی کا چلتا تھا اور مرغ بازی کی پالی میں بیشتر ریزیڈنٹ کے مرغ کی جیت ہوتی تھی لیکن حکمراں کے اختیار میں ایسے وسائل تھے جن سے دادِ عیش کے ساتھ دادودہش بھی ہو سکتی تھی اس لیے دلی کے اکثر ارباب علم وفن نے لکھنؤ کی طرف ہجرت کی اور لکھ لٹ شاہان اودھ کی فیاضی سے فیضیاب ہوئے۔ لیکن بعض ہستیاں ایسی بھی تھیں جنھیں "دلی کی گلیاں" پیاری تھیں اور اس "اجڑے دیار" کو چھوڑ کر وہ کہیں اور جانا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں میں ایک ہستی اسد اللہ خاں غالبؔ کی تھی جو بعد کو لکھنؤ کی نئی ابھرتی ہوئی شاعری کے لیے مشعل ہدایت ثابت ہوئے۔

غالبؔ کی ابتدائی زندگی متمول اعزا کے ساتھ ظاہراً عیش وعشرت سے بسر ہوئی تھی لیکن بچپن ہی میں والدین کا شفیق سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے نوجوان اسد اللہ خاں کے حساس دل میں جو کسک

پیدا ہوئی تھی اس نے غالب کی ساری زندگی کو افسردہ کر دیا اور اس کی شاعری ہمہ تن درد بن کر رہ گئی۔ لیکن اسی حساس دل میں زندگی کے کچھ بلند تر مقاصد بھی اُبھرے اور اس نے اردو شاعری کو محض لذت گوش و نظر کے محدود دائرے سے نکال کر مذہب، فلسفہ، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست جیسے بلند مباحث سے آشنا کیا۔ خودداری اور غیرت تو مغل خاندان سے ختم ہو چکی تھی اس لیے غالب جو مغل شاہ کا "وظیفہ خوار" تھا اس کی توقع کیسے کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ غالب نے دستور زمانہ کے مطابق امراء، رؤساء کی شان میں حتیٰ انگریز افسران کی شان میں مبالغہ آمیز قصیدہ خوانی کی ہے لیکن چونکہ اس مضمون میں ہمارا تعلق صرف غزلیہ شاعری سے ہے اس لیے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔ اگرچہ ان پر بھی غالب کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

لکھنؤ کے شاہی دربار میں شراب و کباب کا چرچا دنیا کے دیگر حالات کے مقابلہ میں زیادہ تھا اور وہاں کی شاعری بھی اسی رنگ میں رنگ گئی تھی اور دلی سے جو اہل علم و فن یہاں آئے وہ بھی اسی کان نمک میں مل گئے چنانچہ انشاء اللہ خاں جیسے فاضل اجل کو سعادت علی خاں کے دربار میں شاہی مسخرے کا کردار سنبھالنا پڑا اور اسے عمر بھر شکایت رہی کہ سعادت علی خاں کی صحبت نے اس کی شاعری کو بگاڑ دیا۔ اس دور کی لکھنؤ شاعری کے رجحان کا اندازہ کچھ ایک لطیفے سے کیا جا سکتا ہے جو یہ ہے کہ اس وقت کے ممتاز شاعر جرأت نے ایک مصرع تصنیف کیا اور دوسرے مصرع کی فکر میں مستغرق تھے کہ انشاء اللہ خاں وہاں پہنچ گئے اور جرأت نے اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔ جرأت کا مصرع تھا ؏

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

انشاء نے فوراً اس پر دوسرا مصرع لگا دیا کہ ؏

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

کہنے کو تو یہ جرأت کے نابینا ہونے پر چوٹ ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جرأت کے مصرع کی لغویت کے مقابلے میں انشا کے مصرع میں پھر بھی کچھ معنویت ہے۔ اس وقت کے شاعر کنگھی چوٹی، زلف کمر اور عشق عاشقی کے مضامین پر اپنی ساری ذہانت اور قدرت بیان صرف کرتے تھے۔ عورت کا لقب "رنڈی" ہو گیا تھا اور عورت کے لیے "سواری" کا لفظ آج بھی لکھنؤ میں زبان زد ہے۔ لکھنؤ کے شاہی دربار کا جو رنگ تھا وہی اودھ کے راجے مہاراجے اور امرا کا حال تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے تعیش کے خول میں بند تھے اور لکھنؤ میں چونکہ انقلاب حکومت بالکل پُرامن طریقہ پر ہوا کہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کو خاموشی کے ساتھ کلکتہ روانہ کر دیا گیا اور قیصر باغ، چھتر منزل پر انگریز بہادر کا جھنڈا لہرانے لگا لیکن اہل لکھنؤ کے

کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور چند ماہ بعد جو غدر ہوا وہ انگریزی فوج کی دو ٹولیوں میں جنگ تھی جس سے لکھنؤ کی فضا اور ماحول پر کوئی اثر نہ پڑا اور بجز محدودے چند ممتاز افراد کے کسی نے اس آویزش سے کوئی دلچسپی نہ لی چنانچہ شاہان اودھ کا دور ختم ہونے کے بعد بھی مدت تک لکھنؤ کی فضا وہی رہی جو شاہی زمانے میں تھی۔ البتہ انشاؔ اور جرأتؔ کے بعد لکھنؤ کی شاعری نے ایک نیا چولا بدلا جس نے اسے دلی کی شاعری سے ممتاز کر دیا اس نئے دور میں اگرچہ شاعری کے مغز میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اب الفاظ کے الٹ پھیر، ضلع جگت، صنائع و بدائع اور الفاظ کی بازی گری کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی اور یہ ایک قدم ترقی کی طرف تھا جس کے ممتاز نمائندے آتشؔ و ناسخؔ تھے لیکن انقلاب انگیز تبدیلی کا دور اس کے بعد آیا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی لکھنؤ میں تعلیم یافتہ اصلاح پسند شعرا کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو شاعری کو ماحول کے تقاضوں اور زندگی کے بابند مقاصد سے روشناس کرنا چاہتا تھا اور ان کے لیے اگر کوئی نمونہ ہو سکتا تھا تو وہ غالبؔ کا تھا۔ چنانچہ اس دور کے لکھنؤ کے شعرا پر غالبؔ کے اثر کی گہری چھاپ ہے بیسویں صدی کے شروع میں معیار پارٹی کا قیام عمل میں آیا جس کے سکریٹری حکیم محسن خاں آبرؔ نے اپنی جد و جہد اور حسن اخلاق سے تمام ہم خیال شعرا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لیا اور باری باری ہر ممبر کے یہاں معیار پارٹی کا مشاعرہ ہوتا تھا جس میں مقررہ ردیف پر شعرا حضرات طبع آزمائی کرتے تھے اور قوافی کی کوئی قید نہ تھی۔ پارٹی کے ماہانہ رسالہ میں مشاعرے کی روداد شائع ہوتی تھی۔ چونکہ ہر قافیہ کے ذیل میں مختلف شعرا کا ایک ایک شعر ہوتا تھا اس لیے ہر شاعر کو اس کا موقع ملتا تھا کہ وہ اس قافیہ میں اپنے شعر اور دوسروں کے شعروں کا موازنہ کر سکے اور آئندہ مزید ترقی کی طرف قدم بڑھائے۔ لیکن اس نیک مقصد نے چشمک اور رنجش کی بھی راہیں کھول دیں اور انتخاب اشعار پر سکریٹری کو مورد اعتراض بنایا جانے لگا۔ اس طرح ایک بہت پر لطف ماہانہ صحبتِ احباب تھوڑے ہی دن بعد درہم برہم ہو گئی۔ بنجوؔ موہانی اور یاسؔ عظیم آبادی (بعد کے یگانہ چنگیزی) معیار پارٹی کے مستعد اراکین تھے لیکن کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ یہ دونوں حضرات پارٹی سے الگ ہو گئے اور آخر الذکر نے غالبؔ کی مخالفت میں ایک محاذ قائم کر لیا اس لیے کہ معیار پارٹی غالبؔ کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ لیکن اگرچہ معیار پارٹی ختم ہو گئی تاہم جس نئی تعمیر کی اس نے داغ بیل ڈالی تھی وہ رفتہ رفتہ بلند ہی ہوتی رہی اور بالآخر لکھنؤ کی شاعری کی منزل کا ایک نمایاں سنگ میل بن گئی۔ اس دور میں کئی کامیاب شعرا پیدا ہوئے اور خود معیار پارٹی کے اراکین کی تعداد معقول تھی جو شاعری کے تصور میں عموماً ایک دوسرے کے ہم خیال تھے۔ اس دور کے تمام ممتاز شعرا کا ذکر بہت طویل ہو جائے گا اور پھر بھی انتخاب کا مسئلہ بنائے تنازعہ رہے گا اس لیے ہم اس دور کے صرف تین شاعروں ثاقبؔ جعفری، عزیزؔ

(بترتیب حرف تہجی) کو لیتے ہیں اور ان حضرات پر غالب کے اثر کو واضح کرنے کے بعد امید ہے کہ اس پورے دور کی شاعری پر غالب کے اثر کی وضاحت ہو جائے گی لیکن اس سلسلہ میں یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ تقابل کا مقصد صرف غالب کے اثر کو دکھانا ہے۔ یہ امر کہ ان حضرات کے تخیل کی لبندی غالب کی حد تک پہنچی یا اس سے آگے نکل گئی یا پیچھے رہ گئی ہماری بحث سے خارج ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب کے مذہب کا صحیح تعین تو اس کے کلام سے نہیں ہو سکتا لیکن یہ تینوں حضرات راسخ العقیدہ شیعہ تھے اور غالب کے برخلاف شراب اور دیگر منہیات شرعیہ سے پورے طور پر محترز۔ غالب نے ایک عدالت کے سامنے کہا تھا کہ میں آدھا مسلمان ہوں اور تشریح یہ کی کہ سور نہیں کھاتا اور شراب پیتا ہوں بہرحال یہ رواروی کا جواب تھا لیکن غالب کی مذہب کے بارے میں جستجو اس کے کلام سے صاف ظاہر ہوتی ہے مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

پھر یہ کہ ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہاں پر غالب مجسم سوال ہے اور اس سوال کا تشفی بخش جواب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو نہ مل سکا۔ اس لیے کہ ایک طرف وہ یہ کہتا ہے کہ ؎

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں صورت اشیا مرے آگے

لیکن دوسری جگہ بڑے وثوق سے کہتا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہاں وہ تو افلاطونی مذہب وجودیت کا قائل معلوم ہوتا ہے جو فارابی اور ابن عربی کے ذریعہ سے اسلام میں داخل ہوا اور تصوف کا سنگ بنیاد ہے، نیز ہند و فلسفہ و ویدانت سے بھی ملتا جلتا ہے اور اسی عقیدہ کا اظہار اس نے اکثر اشعار میں بھی کیا ہے۔ لیکن پھر کہتا ہے ؎

اُن کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند — واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

یعنی امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور پھر ؎

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان — نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

جس سے شیعیت کی طرف جھکاؤ معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی کہا ہے کہ

زنار باندھ سبحہ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ایک طرف تو یہ لن ترانی ہے کہ ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور دوسری طرف ایک نہیں کئی قصیدوں اور قطعات میں اس نے اہلِ ثروت کے سامنے دستِ سوال دراز کیا ہے۔

اب آپ ان حضرات پر غالب کے اثر کو دوبدو تقابل کی شکل میں ملاحظہ فرمائیے :

غالب	ثاقب
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	دل کو تاکید وفا ہے کہ فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا	درد کو حکم قضا ہے کہ دوا ہو جانا
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ	قصۂ طوفاں کو دھو دوں گا دلوں سے ایک دن
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار	گر شب فرقت رہی اور دیدۂ تر رہ گیا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی	ضعف میں تھک کر کہیں بیٹھا تو اٹھنا ہے محال
ہر قدم سایے کو اپنے میں شبستاں سمجھا	نقشِ پا ہوں رہ گیا جس سر زمیں پر رہ گیا
گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا	راحتوں میں بھی جنوں کا وہی ساماں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا	پھیلتا بھی دل عاشق تو بیاباں ہوتا
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام	ساقی نے کیا پلا دیا اے پاک دل مجھے
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں	آزاد ہو کے بندۂ میخانہ ہو گیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے	غربت دلا رہی ہے مجھے اپنے گھر کی یاد
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا	لیکن یہی کہ لٹ گیا ویرانہ ہو گیا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے	پسینہ آ گیا مجھ کو گناہوں کی ندامت سے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا	ذرا اے ابرِ رحمت اپنے دامن کی ہوا دینا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے	شبِ غم میں زندگی کا کسے اعتبار ہوتا
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا	مری جان جا چکی تھی جو نہ انتظار ہوتا

غالب

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی
$1 + 2 + 4$ = ہفت آسماں

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بد مزہ نہ ہوا

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

یا رب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لیے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہ ہو تیرا تو مری جان خدا ہے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پہ
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خار بیاباں پہ

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

ثاقب

دل پارہ پارہ تجھ کو کوئی یوں تو دفن کرتا
وہ جدھر نگاہ کرتے ادھر اک مزار ہوتا

ہم کو اس میکدۂ دہر سے امید نہیں
ساغر الٹا ہوا ہے گنبد مینائی کا

وہ نہ آئیں سر بالیں کہ میں بچنے کا نہیں
دم نہ ٹوٹے مرے ساتھ ان کی مسیحائی کا

آشنا تھا مذاق عشق میں دل
تلخ کامی سے بے مزہ نہ ہوا

دہر لا حاصل میں سب کچھ مجھ کو حاصل ہو گیا
یوں جہاں سمٹا کہ پہلو میں مرا دل ہو گیا

نہیں مانا تو خیر اچھا کیا لیکن مٹایا کیوں
کہ میں اس دار فانی میں نہ حق تھا اور نہ باطل تھا

بنتے ہی گھر ابتدا میں ردگش انجام تھا
تنکے چن کر جب نظر کی آشیاں اک دام تھا

ہوں مشت خاک جلنے کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ داغ پڑتے تھے وہ دل نہیں رہا

وہ کر گئے تھے مجھ کو بلاؤں کے حوالے
سب جھیل لیں میں نے کہ مرا بھی تو خدا ہے

رحم آیا انھیں جب میں نہ رہا قابل رحم
میری گردن پہ چھری پھیر کے غصہ اترا

گو خاک کا پتلا ہوں لیکن کوئی کیا سمجھے
میں بھی کوئی شے ہوں جو گردوں ہے مری کد میں

شمشیر و سر کی لاگ فقط میرے دم سے ہے
سارا ہوا کا کھیل ہے موج و حباب میں

غالب

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں صورتِ اشیا مرے آگے

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

جانا پڑا رقیب کے گھر پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہیں رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب میں
اس سال کے حساب میں برق آفتاب ہے

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

ثاقب

پھیلا ہے حسنِ عارضِ روشن نقاب میں
کیا کیا تڑپ رہی ہے تجلی حجاب میں

نظر کر غور سے آئینۂ اسرارِ ہستی پر
جسے تو زندگی سمجھا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نظر
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

بعد میرے کیا ہوئی وہ دلفریبی حسن کی
شام ہی سے آج سناٹا تری محفل میں ہے

کب سے ہے غم خبر نہیں کچھ ماہ و سال کی
گنتا ہوں ایک عمر سے گھڑیاں ملال کی

دل ہو گیا مجروح کماں اب نہ اٹھاؤ
تھم جاؤ اسی تیر پہ مرتا ہے جگر بھی

میں اور صبح ہے یہ تمنا محال کی
جتنی مری حیات شب اتنے ہی سال کی

بدلا مزاجِ دہر، مٹا دل، تھکے طبیب
حالت وہی رہی مرضِ لازوال کی

آؤ تو ہم دکھائیں تمہیں اک نیا جہاں
آباد ہے خیال میں دنیا مثال کی

عشق کی معراج تو حق تھی مگر تقدیر سے
جا کے تھوڑی دور ہمت ہار دی منصور نے

نہ تڑپے جو وہ پیشِ حسنِ خرمن سوز کیوں جائے
غشی عالم کی تھی اک دل لگی برقِ تجلی کی

غالب

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

ثاقب

اپنے دامن کو سمیٹ اے روشنئ برقِ طور
جلوۂ رخ آنکھ والوں کو دکھانا چاہیے

ذرے ذرے سے عیاں ہے گردشِ تقدیرِ دل
ہر بگولا دشت میں میرا علمبردار ہے

گلشن کا رنگ دو دن اک حال پر نہیں ہے
کل جن کے آشیاں تھے آج ان کا پتہ نہیں ہے

مدت سے شب کی عشرت ڈوبی ہوئی ہے غم میں
یہ دیدۂ جہاں ہیں کس وقت تر نہیں ہے

اس چشمِ معرفت سے وہ کس طرح چھپیں گے
کوئی حجاب جس کی حدِ نظر نہیں ہے

ہو گئے برسوں کہ آنکھوں کی کھٹک جاتی نہیں
جب کوئی تنکا اڑا گھر اپنا یاد آیا مجھے

نہیں ہے غنچۂ دل کی شگفتگی ممکن
ہزار بار اگر موسمِ بہار آئے

غیر کے اسباب زینت اپنی جانکاہی سے ہیں
لاکھ آنسو ابر کے ٹپکیں تو اک گوہر بنے

اپنا سا زور کر کے تھکے منعمان دہر
مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

یہ سر اور پائے درباں وحشتِ دل کا تقاضا ہے
مجھے اس بے بسی پر خود ہنسی بے اختیار آئی

چھپاؤ آپ کو جس رنگ یا جس بھیس میں چاہو
مگر چشمِ حقیقت بیں سے پردا ہو نہیں سکتا

امیدِ وصل محشر پر اٹھا رکھ اے دلِ ناداں
کہ دنیا میں اگر وعدہ وفا ہوتا تو ہو جاتا

غالب

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

غالب

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی ہم کو تو یہ سمجھا دو وہ سمجھائیں گے کیا

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی واماندگی میں نالہ سے لاچار ہے

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہوں تو یہ بھی نہ سہی

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

دل میں ذوقِ وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

ثاقب

نظر کر غور سے آئینۂ اسرارِ ہستی پر
جسے تو زندگی سمجھا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے

چپکے پڑے تھے کب سے شب انتظار میں
سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے آواز صور کی

صفی

زبان دار پہ بے ساختہ شور انا الحق ہے
اثر دیکھو کسی آتش نوا کی ہمنوائی کا

سر طور آج بھی برقِ جمال یار ہو پیدا
اگر اس منزلت کا طالب دیدار ہو پیدا

اس خطا پر مجھے دوزخ میں لیے جاتے ہیں
در فردوس کو بھولے سے ترا گھر سمجھا

جو حضرت ناصح کہیں وہ سب مجھے منظور
مجبور ہوں اک صبر تو ہاں ہو نہیں سکتا

مرے چھپائے سے کب سوزِ دل نہاں ہوگا
جہاں چلے گی کوئی شے وہیں دھواں ہوگا

جواب نہ آئے تو کیا آئیے گا پھر اس وقت
ہمارے آپ کے قرآن درمیاں ہوگا

یہ ناتوانی سے اب ہے نقشہ کسی کے بیمار دل حزیں کا
کہ مثل نقش قدم وہ بیٹھا جہاں کہیں ہو رہا وہیں کا

ہے آزمائش تیغ و گلو تو بسم اللہ
پھر اس کے بعد بھی کیا کوئی امتحاں ہوگا

نیو کھودی گئی جس دن مرے کاشانے کی
جوش زن خاک کے پردے سے تھا ویراں ہونا

ساز و برگ عشرت اہل تمنا جل گیا
سوز غم سے خون دل میں جس قدر تھا جل گیا

غالب

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

عنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

میری قسمت میں غم جو اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

صفی

وہ لہو کا قطرہ جس سے کہ دھواں سا اٹھ رہا ہے
دل سنگ جذب کرتا تو یہی شرار ہوتا

صفحۂ ہستی نہیں بازیچۂ اطفال ہے
ایک نقش اس پہ بنا اور ایک مٹ کر رہ گیا

بو خوشگوار رنگ نہایت نظر فریب
پھل تلخ ہے مگر چمن روزگار کا

مدعا مسجد سے کیا مقصود بت خانے سے کیا
قید مذہب سے علاقہ تیرے دیوانے سے کیا

خجل تھا کثرت عصیاں سے ناگہاں دل نے
اشارۂ کرم بے حساب دیکھ لیا

ہو جل کے اگر خاک سراپردۂ ہستی
پھر بیچ میں حائل کوئی پردہ نہ رہے گا

نازک بہت ہے مسئلہ زندگی صفی
دنیا تمام کارگہ شیشہ گر ہے آج

منصب عشق مسلم نہ رہا میرے بعد
دوش پہ حسن کے ہے شال عزا میرے بعد

خط بھیج کے دیتا ہوں یہی دل کو تسلی
اب نامہ بر آیا ارے اب نامہ بر آیا

کیونکر کہوں ستم سے اٹھایا نہ جائے گا
نازک وہ ہاتھ جس میں کہ تلوار بھی نہیں

نہ دانا خاک میں ملتا نہ پاتا اوج سرسبزی
ابھرتے ہیں وہی اک دن جو اپنے کو مٹاتے ہیں

خلق کرنا تھا غم عشق کے قابل مجھ کو
جتنے تھے داغ نہ کیوں اتنے دیے دل مجھ کو

غالب

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

۱ + ۲ + ۴ = ۷ = ہفت افلاک

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے

غالب

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

اے دل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر
کون لا سکتا ہے تاب جلوہ دیدار دوست

بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

صفی

اٹھ رہے اب کس لئے جنت پہ شغل مے کشی
جو وہاں ہوگا یہیں وہ لطف حاصل کیوں نہ ہو

مہر منور جام طلائی، ماہ کٹورا چاندی کا
چرخ کے خمخانے میں یہی ہیں گردش میں پیمانے دو

کرتی ہے آئینہ بندی خود نمائی آپ کی
جلوہ گاہ ناز ہے ساری خدائی آپ کی

راہ چلتے جب کوئی ٹھوکر لگی
ہم یہ سمجھے اک نصیحت مل گئی

ہمیں تو موت سے بدتر ہے زیست بے احباب
یہ خضر ہی سے ہوا عمر جاوداں کے لیے

دکھلا رہا ہے سوز غم ہجر کی بہار
داغوں سے دل کو سرو چراغاں کیے ہوئے

عزیز

رنگ ہر پھول میں ہے حسن خود آرائی کا
چمن دہر ہے محضر تری یکتائی کا

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا
نور جل جائے ابھی چشم تماشائی کا

گرہ دل کی کھلی اک ناخن رنگیں سے خوں ہو کر
ہمیں یہ طرز حل عقدۂ مشکل پسند آیا

ربط دیرینہ سے باقی ہے تعلق پھر بھی
لاکھ کعبے سے بنائے کوئی بت خانہ جدا

پردے دوئی کے دیدۂ عالم سے اٹھ گئے
جز جلوہ ہائے رخ کوئی حائل نہیں رہا

غالب

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

نظر میں ہے ہمارے جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا

نام کا ہے وہ مرے دکھ جو کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

عزیز

مآلِ ہستیِ موہوم معلوم
عزیز اک شغلِ لاحاصل میں کیا ہے

یہ ذرے خاکِ دل کے سیکڑوں عالم بنائیں گے
اسی دنیا میں ہیں، دنیا مگر خود ان میں داخل ہے

مے سے توبہ تو کی عزیز مگر
اکثر اوقات یاد آتی ہے

خامشی اس سے بہتر اے کاش دل ہمارا
ہر نالہ نارسا ہے، ہر آہ بے اثر ہے

دورِ حیات کتنا گھبرائیں کس لیے ہم
یہ داستانِ ہستی دم بھر میں ختم پر ہے

مری جمعیتِ خاطر کا ساماں حشر کیا کرتا
قیامت ہو گئی ترتیب اجزائے پریشاں میں

انجمن کیسی تم اپنی ذات سے محفل بنو
گوشۂ خلوت میں بھی بیٹھو تو اک محفل بنو

کھلتا ہی نہیں فریبِ ہستی
کچھ بھی نہیں اور کیا نہیں ہے

ہو گا ہر حال میں جو عشق کی تقدیر میں ہے
کارکنِ حسنِ ازل پردۂ تدبیر میں ہے

سنگِ بنیاد وہ دل ہے حرکت جس کی حیات
ابتدا ہی سے خرابی مری تعمیر میں ہے

بزمِ ہستی میں ضروری ہے کوئی روحِ رواں
ایک جنبش سی جو اس پردۂ تصویر میں ہے

میرے غم کی یہ حقیقت ہے کہ روزِ خلقت
جو کسی نے نہ لیا وہ مری تقدیر میں ہے

غالب

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا وہ طوفاں نکلا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ذکر اس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

عزیز

یہ منہ چھپائے جاتے ہیں جو سوئے میکدہ
مجھ سے بھی ان جناب سے کچھ رسم و راہ ہے

بجز روح القدس دے کون داد اس نغمہ سنجی کی
نہ کوئی ہم سخن میرا نہ کوئی ہم زباں میرا

ذرے ذرے پہ لگی ہے مہر کیا سمجھے کوئی
راز تو لاکھوں ہیں لیکن رازداں کوئی نہیں

اب التفات اسے کہیے خواہ بیزاری
خطا کسی کی ہو مجھ پر عتاب ہوتا ہے

کچھ انتہا بھی ہے لو بند ہو گئیں آنکھیں
نگہ نے کام کیا جب تک انتظار کیا

آزادگان عشق کی مٹی خراب تھی
جب تک کہ ضبط مانع رسم و قیود تھا

تھی جس کے دم سے کیفیت لذت نشاط
مدت ہوئی عزیز کہ وہ دل ہی کھو گیا

تھی مری ہستی بھی جب اک قطرہ دریا نما
کیوں نہ ہم آغوش کر کے پھر مجھے دریا کیا

بے حقیقت دل کی ہستی کو وہ سمجھے تھے مگر
اس لہو کی بوند نے عالم تہ و بالا کیا

کہتے ہیں ریختہ کو جو اس طرز پہ عزیز
کچھ لوگ اور شہر میں ہیں اک تمہیں نہیں

قفس میں جی نہیں لگتا ہے آج پھر بھی میرا
یہ جانتا ہوں کہ تنکا بھی آشیاں میں نہیں

جنون شوق کا یہ مختصر سا قصہ ہے
اب امتیاز رقیب اور رازداں میں نہیں

غالب

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

عزیز

کہہ کے بیت الصنم سے ہم پلٹے
کیا ہمارا کوئی خدا ہی نہیں

وہ وفا کیش نہیں عاقبت اندیش نہیں
امتحاں گاہ محبت میں جو دلریش نہیں

عشق برافروختہ درماں سے ہوگا اور تیز
جو بجھانے سے بجھے ایسی یہ چنگاری نہیں

درِ منعم پہ ہے مقصود گدائی کس کو
دل پُر حوصلۂ اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اس کے شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

بے نیازی پہ تری نازِ سیہ کاروں کو
اُلٹے پھر آئے درِ توبہ اگر وا نہ ہوا

سوزِ غم سے اشک کا ایک اک قطرہ جل گیا
آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا

آنسو میں ضبط شرحِ تمنّا کرے کوئی
قطرہ میں غرق وسعتِ دریا کرے کوئی

اے سوزِ دل کہاں کی بھری تھی یہ دل میں آگ
جب آہ کر چکا تو میں اک موجِ دود تھا

غالبؔ کا طرز لکھنؤ میں رائج ہونے پر شعرائے لکھنؤ نے دل کھول کر اس طرز پر طبع آزمائی شروع کردی ان سب غزلوں کا ذکر ہی خاصا طویل ہو جائے گا لیکن مناسب ہوگا کہ آخر میں حضرات ثاقبؔ، صفیؔ، عزیزؔ کی چندان غزلوں کا انتخاب نمونۃً پیش کر دیا جائے جو غالبؔ کے طرز پر کہی گئی ہیں اور اسی سے عام رجحان کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے :۔

مرزا ذاکر حسین ثاقبؔ قزلباش

دل کو تاکیدِ وفا ہے کہ فنا ہو جانا
درد کو حکمِ قضا ہے کہ دوا ہو جانا

کم سمجھتا ہے محبت میں فنا ہو جانا ۔ دل کی قسمت میں ہے کیا جانیے کیا ہو جانا

جانچتے ہیں وہ مرا حال دل اے نالۂ غم ۔ تو بھی ٹوٹے ہوئے شیشے کی صدا ہو جانا

خم گیسو سے نکلنا مرے دل کا توبہ ۔ وہ گرہ ہے جسے آتا نہیں وا ہو جانا

فائدہ دیتی ہے کیا چادر قبر منعم ۔ ہاں مگر بوجھ پہ اک بوجھ سوا ہو جانا

زندگی ہے ترے بڑھنے ہی تک اے زلف ذرا ۔ چوم کر ان کے قدم میری بلا ہو جانا

جیتے جی آئے قیامت تو مزہ ہے ثاقب
دیکھ لیں وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

وہ نہیں ہوں میں کہ جس پہ کوئی اشکبار ہوتا ۔ کبھی شمع بھی نہ روتی جو مرا مزار ہوتا

شب غم میں زندگی کا کسے اعتبار ہوتا ۔ مری جان جا چکی تھی جو نہ انتظار ہوتا

دل پارہ پارہ تجھ کو کوئی یوں تو دفن کرتا ۔ وہ جدھر نگاہ کرتے ادھر اک مزار ہوتا

مرے دل نے بڑھ کے روکا ترے تیر جانستاں کو ۔ جو یہ بیچ میں نہ پڑتا تو جگر کے پار ہوتا

وہ لحد پہ ان کا آنا وہ قدم قدم پہ محشر ۔ میری نیند کیوں اچٹتی اگر ایک بار ہوتا

جو ہمارے دیکھنے کو کبھی آپ آ نکلتے ۔ وہی آنکھ در پہ ہوتی وہی انتظار ہوتا

وہ جہاں میں آگ لگتی کہ بجھائے سے نہ بجھتی
مرے دود دل میں ثاقب جو کوئی شرار ہوتا

ان کی آرائش سے میرے کام بن جائیں گے کیا ۔ دل کی گتھی شانہ ہائے زلف سلجھائیں گے کیا

وصل کے وعدے سے خوش ہو کر نہ مر جائیں گے کیا ۔ نامہ بر ہنستا ہوا آتا ہے خود آئیں گے کیا

ہاتھ ادھر اٹھتا نہیں ہے تار ادھر باقی نہیں ۔ دیں گے وہ کیا اور ہم دامن کو پھیلائیں گے کیا

قصۂ فرہاد و مجنوں کیوں سناتے ہو ہمیں ۔ جب پریشانی سے مطلب ہے تو گھبرائیں گے کیا

میہمان کوئے جاناں ہو کے دل بیتاب ہے ۔ میں تو سمجھاتا نہیں وہ بھی نہ سمجھائیں گے کیا

تنکے تنکے کا خدا حافظ چلے ہم باغ سے ۔ الوداع اے آشیاں اب جا کے پھر آئیں گے کیا

دل کی بیماری کا عقدہ کھولنا دشوار ہے
جو نہیں سمجھے وہ ثاقب مجھ کو سمجھائیں گے کیا

دل کیوں تپاں ہے کوچۂ دلدار دیکھ کر ۔ آگے بڑھوں گا چرخ کی رفتار دیکھ کر

طے کر کے آج خانہ بدوشی کی منزلیں ۔ بیٹھا ہوں اس کا سایۂ دیوار دیکھ کر

کچھ کچھ زمانہ جان گیا کارِ حسن و عشق
منصور کو جہان میں سرِ دار دیکھ کر

اب دھر رہ شناس وفا و جفا ہوا
میرے گلے پہ آپ کی تلوار دیکھ کر

وقفِ زبانِ اہلِ حسد ہے لہو مرا
خوش ہو رہا ہوں وادیِ پُرخار دیکھ کر

وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر
جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

ثاقب عجب نہیں کہ سرِ طورِ امتحاں
غش دل کو آئے جلوۂ اشعار دیکھ کر

حسن کی وہ صورتیں خواب پریشاں ہو گئیں
پردۂ دل میں لگا کر آگ پنہاں ہو گئیں

چھپ گئیں آنکھوں سے ذروں میں نمایاں ہو گئیں
بستیاں اجڑی ہوئی مل کر بیاباں ہو گئیں

لوٹ لی گردوں نے آخر دل کی ساری کائنات
کچھ تمنائیں تھیں وہ بھی وقفِ نسیاں ہو گئیں

کم نہ سمجھو دہر میں سرمایۂ اربابِ غم
چار بوندیں آنسوؤں کی بڑھ کے طوفاں ہو گئیں

خانماں بربادیوں کا مجھ پہ احساں ہے کہ میں
اُن زمینوں میں نہیں جو بس کے ویراں ہو گئیں

کیا وفاداروں کے جی ڈوبے ہیں جوشِ عشق میں۔
کشتیاں دل کی ہزاروں نذرِ طوفاں ہو گئیں

مجمعِ احباب کی روداد ثاقب کیا کہوں
اب وہ اگلی صحبتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

یہ نہ سمجھو کہ فلک برسرِ بیداد نہیں
بات یہ ہے کہ مجھے عادتِ فریاد نہیں

دل میں ہے کثرتِ غم پر بھی وہی سناٹا
گھر میں اک بھیڑ لگی ہے مگر آباد نہیں

فقط آواز پہ موقوف ہے آبادیٔ دہر
جس جگہ شہرِ خموشاں ہے وہ آباد نہیں

کھو گیا دل کی صدا ہے اثرِ غارتِ ہوش
یہیں پہلو میں ہے موجود مگر یاد نہیں

عشق اک جوہرِ عالی ہے جو کم ملتا ہے
تیشہ و سنگ بہت ہیں سرِ فرہاد نہیں

کتنے بے ہوش ہیں یہ نشۂ دنیا والے
میکدہ یوں نظر آتا ہے کہ آباد نہیں

کون ہے جس سے کروں غم کی شکایت ثاقب
میں تو ہیں محفلِ عالم میں کوئی شاد نہیں

تیغ کے ہمراہ میرا دل کفِ قاتل میں ہے
موت ہے آسان لیکن جان کس مشکل میں ہے

جتنی عالم میں ہے بے چینی وہ میرے دل میں ہے
یا الٰہی کون سا معشوق اس محمل میں ہے

بعد میرے کیا ہوئی وہ دلفریبی حسن کی
شام ہی سے آج سناٹا تری محفل میں ہے

عاقبت بینی سے شوق دل کا بس چلتا نہیں
اک قدم ہے راہ میں تو اک قدم منزل میں ہے

کس قدر دشوار ہیں اہل عدم کے راستے
پاؤں جس منزل میں رکھا تھا اسی منزل میں ہے

دم بدم آواز دیتی ہے خدنگ ناز کو
خون کی ایک بوند جو باقی ہمارے دل میں ہے

ایک طوفانِ بلا امڈا ہے ثاقبؔ دور تک
سر اٹھائے ہے وہ کانٹا جو مری منزل میں ہے

راحتوں میں بھی جنوں کا وہی ساماں ہوتا
پھیلتا بھی دل عاشق تو بیاباں ہوتا

جیتے جی سایۂ دیوارِ چمن تک نہ گیا
مر کے کیا پھول کا شرمندۂ احساں ہوتا

تختۂ مشق حوادث تھا اکیلا ہی رہا
دل بھی وہ گھر تھا کہ جس میں کوئی مہماں ہوتا

نبض و دل ڈوب گئے ہجر میں روتے روتے
اور کیا چاہتے ہو نوح کا طوفاں ہوتا

خون دل رنگ بدلتا نہ اگر اشکوں کا
یہ سمندر مرے زخموں کو نمک داں ہوتا

کشتۂ آفت تقدیر ہے ہر شمع و چراغ
آگ لگتی نہ تو پھر کیوں کوئی عریاں ہوتا

وائے قسمت کہ مرا خاک شدہ دل ثاقبؔ
جل نہ جاتا تو چراغ شب ہجراں ہوتا

عشق مظلوم بے خطا نہ ہوا
حسن اچھوں میں بھی بُرا نہ ہوا

سونے والوں کو کیا خبر اے ہجر
کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا

بستر اٹھا نہ کوئے قاتل سے
شکر ہے پاس بوریا نہ ہوا

دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
وہ تماشا جو بر ملا نہ ہوا

کیا کہے بے زباں اسیر قفس
کیوں ہوا قید کیوں رہا نہ ہوا

آشنا تھا مذاق عشق سے دل
تلخ کامی سے بے مزہ نہ ہوا

حسرت ذبح رہ گئی ثاقبؔ
یہ فریضہ مرا ادا نہ ہوا

مولانا سید علی نقی صفی

جو پیدا ہی نہ میں آزردہ جاں ہوتا تو کیا ہوتا
ہوا تھا خلق اگر دل شادماں ہوتا تو کیا ہوتا

نہیں جب طاقت پرواز ہی دل خستہ بلبل میں
قفس پھر کیا ہوا ہے آشیاں ہوتا تو کیا ہوتا

میں کچھ کہتا نہیں اس پر تو ناصح کا یہ عالم ہے
خدا جانے جو میرا راز داں ہوتا تو کیا ہوتا

وہی مجھ کو ملاتے خاک میں آخر جو ملنا تھا
ہوا تھا بے نشاں یوں بے نشاں ہوتا تو کیا ہوتا

جب اس نامہربانی پہ صفی یوں جان جاتی ہے
خدا جانے جو وہ بہت مہرباں ہوتا تو کیا ہوتا

یہ کسی کو کیا غرض تھی کہ جو غمگسار ہوتا
ہمیں دل پہ جبر کرتے اگر اختیار ہوتا

ترے وعدے کی وفا کا مجھے اعتبار ہوتا
جو طلوع صبح محشر شب انتظار ہوتا

دل سادہ لوح اپنا یہ بتوں کا معتقد ہے
جو غلط بھی وعدہ کرتے اسے اعتبار ہوتا

کہیں روز حشر آتا کہ یہ سیر دیکھ لیتے
کوئی داد خواہ ہوتا، کوئی شرمسار ہوتا

مری لاش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

کہیں مثل شمع کشتہ ہم اس انجمن سے اٹھتے
کہ صفی جنازہ اپنا نہ کسی پہ بار ہوتا

موت ہے زیست میں شرمندۂ احساں ہونا
زہر ہے درد کا منت کش درماں ہونا

میری قسمت میں جو اے دل ہے پریشاں ہونا
خاک ہونا بھی تو خاک در جاناں ہونا

نیو کھودی گئی جس دن مرے کاشانے کی
جوش زن خاک کے پردے سے تھا ویراں ہونا

دل مایوس میں جب کوئی تمنا ہی نہیں
عین ساماں ہے مرا بے سروساماں ہونا

اے مرے قتل کا اقرار نہ کرنے والے
تجھ سے کس نے یہ کہا تھا کہ پشیماں ہونا

اہل دل چاہیے رفتار صفی کی تقلید
نہ بہت دوڑ کے چلنا نہ پشیماں ہونا

ساز و برگ عشرت اہل تمنا جل گیا
سوز غم سے خون دل میں جس قدر تھا جل گیا

سن رہا ہوں حسن نے کی خانہ سوزی عشق کی
یہ خبر لیکن نہیں کیا رہ گیا، کیا جل گیا

جام بر کف خرقہ بر دوش آئے جب مسجد میں ہم
بوئے صہبا سے دماغ اہل تقوا جل گیا

طرح غالب پہ صفی ایسی زمین شور ہے
جو ہوا اس میں عرق ریزی سے پیدا جل گیا

جو یہی تھی رسم دنیا تو وہاں مزار ہوتا
کہ جہاں کا ذرہ ذرہ دل بے قرار ہوتا

شب وعدہ کس مزے سے یونہیں صبح تک گذرتی
ادھر اہتمام ہوتا ادھر انتظار ہوتا

کوئی زہر پی بھی لیتا تو وہ دل لگی سمجھتے
کوئی جان دے بھی دیتا تو نہ اعتبار ہوتا

وہ لہو کا قطرہ جس سے کہ دھواں سا اٹھ رہا ہے — دل سنگ جذب کرتا تو یہی شرار ہوتا

صفیؔ اس طرح کسی نے مرے دل میں چٹکیاں لیں — کہ نہ بے قرار ہوتا تو یہ بے قرار ہوتا

لحد صفیؔ پہ ہوتا کسی شب مشاعرہ بھی

وہی شمع اک جلاتا کہ جو سوگوار ہوتا

رہیں لطف ہوں ایسے جنوں فتنہ ساماں کا — جسے دامن کی اٹکل ہے نہ اندازہ گریباں کا

دل خوابیدہ چونک اٹھے گا آنکھیں بند ہونے پر — کہ ہستی دوسرا اک نام ہے خواب پریشاں کا

نگارستان رنگ بیخودی ہے میرا میخانہ — دل روح القدس شیشہ ہے لیکن طاق نسیاں کا

کہیں بہتے ہوئے دریا کا رخ پیچھے پلٹتا ہے — دل شوریدہ کیوں مشتاق ہے عمر گریزاں کا

ہنسی آتی ہے حسن و عشق دونوں کی شکایت پر — گلہ یوسف کو دامن کا زلیخا کو گریباں کا

گلا کٹوا کے بھی پایا نہ آرام سبکدوشی — سر اترا بار لیکن بڑھ گیا قاتل کے احساں کا

یہ پامالی ہے گویا سرفرازی کا مجھے خلعت

صفیؔ وہ سبزۂ خوابیدہ ہوں گور غریباں کا

منصب عشق مسلم نہ رہا میرے بعد — دوش پر حسن کے ہے شال عزا میرے بعد

اثر انداز ہو یارب یہ دعا میرے بعد — کہ جواب ہے وہ بدل جائے فضا میرے بعد

یاد آؤں گا جفا کار دل آزاروں کو — عام ہو جائے گا جب قحط وفا میرے بعد

ہمصفیران چمن یاد مجھے کر لینا — ہو موافق جو گلستاں کی ہوا میرے بعد

فکر میں اس کے مٹانے کی ہے اک جم غفیر — سخت دشوار ہے اردو کی بقا میرے بعد

خاص اردوئے معلیٰ ہے صفیؔ جس کا نام

یہ زباں اب نہ رہے گی بخدا میرے بعد

ڈر ہے شکست رونق بازار دیکھ کر — بک جائیے نگاہ خریدار دیکھ کر

کچھ ریزہ ہائے شیشۂ دل بھی ہیں فرش راہ — رکھیے قدم ذرا دم رفتار دیکھ کر

زنداں سے گھر پلٹ کے جب آئے بلا نصیب — آنسو ٹپک پڑے در و دیوار دیکھ کر

لو چرخ نے بھی کھینچ لیا اب ستم سے ہاتھ — اک فتنہ گر کو بے سبب آزار دیکھ کر

ڈر ہے مجھے کہ رشتۂ الفت نہ ٹوٹ جائے — تسبیح سے کشاکش زنار دیکھ کر

تھے لن ترانیوں سے مگر بے خبر کلیم — ہونا تھا ورنہ تشنۂ دیدار دیکھ کر

دیکھا صفی کہ وہ سر بالیں ہیں جلوہ گر
چونکا جو خواب طالع بیدار دیکھ کر

کیا خبر کیا ہو دعاؤں میں اثر ہونے تک — دل میں اس خانہ برانداز کے گھر ہونے تک
یہی عالم جو رہا رات بسر ہونے تک — زندہ رہنے کے نہیں ہم تو سحر ہونے تک
کیا رہے کیا نہ رہے کون بتا سکتا ہے — ہیئت نظم جہاں زیر و زبر ہونے تک
اختر صبح بنا گوش تھا بننا اک دن
قسمت قطرۂ نیساں ہیں گہر ہونے تک

مرزا محمد ہادی عزیزؔ

ہے فنا آموز ہر اک خط تری تحریر کا — رنگ اڑتا کہہ رہا ہے پیکر تصویر کا
بعد میرے میرا سب ساماں تبرک ہو گیا — حلقہ حلقہ بٹ رہا ہے اب مری زنجیر کا
رنج مرگ ناگہانی کو کفن کا مٹ گیا — جب نظر آیا کفن میں رنگ جوئے شیر کا
اک خدائی جان دینے کے لیے تیار ہے — کیا قیامت ہے کمر سے باندھنا شمشیر کا
اک نگہ نے میری طے کی صورت امید و بیم — سارا جھگڑا مٹ گیا تدبیر اور تقدیر کا
مدتیں گذریں کہ دل میں کوئی بات آتی نہیں — میں ہوں اور دن رات دہرانا تری تقریر کا
لکھ لیا سب قصۂ بربادئ عمر عزیزؔ
کیا کلیجہ تھا ہمارے کاتب تقدیر کا

وہ شوق قتل و ولولہ دل نہیں رہا — اب ان کے امتحان کے قابل نہیں رہا
پردے دوئی کے دیدۂ عالم سے اٹھ گئے — جز جلوہ ہائے رخ کوئی حائل نہیں رہا
یہ شوخئ نگاہ سر بزم تا بہ کے — باقی کسی کے سینے میں اب دل نہیں رہا
ہے ناشکیبئ دل مضطر کا کیا علاج — مانا وہ میرے حال سے غافل نہیں رہا
کب پوچھتے ہیں آ کے مزاج مریض عشق — جب بدنصیب بات کے قابل نہیں رہا
کوسوں دیار عشق میں آبادیاں نہیں — یادش بخیر جب سے مرا دل نہیں رہا
کیا فائدہ ہے عرض ہنر سے عزیزؔ اب
جب امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

غم عشق گر ملا تھا تو کبھی قرار ہوتا — کوئی زور دل پہ ہوتا کوئی اختیار ہوتا

یہ لہو ہے میرے دل کا کوئی دل لگی نہیں ہے
کوئی پوچھتا جو آنسو تو میں اشکبار ہوتا

حرکت کبھی ارادی کسی شے میں پھر نہ ہوتی
دل بے قرار تجھ کو جو کہیں قرار ہوتا

دل مضطرب نہ سنبھلا نہ کبھی سنبھل سکے گا
مجھے پہلے کب تھا قابو جو اب اختیار ہوتا

نظر کرشمہ پیما تجھے کیا اثر ملا ہے
ترے دور میں کبھی تو کوئی ہوشیار ہوتا

مجھے منظر دو عالم یہ دکھا کے کہہ رہے ہیں
تجھے کچھ نظر نہ آتا اگر انتظار ہوتا

وہ عزیز سے یہ کہہ کر پس پردہ چھپ گئے ہیں
تم اداشناس ہوتے تو تمھیں اعتبار ہوتا

وہ خود اسیرِ حلقۂ دام نمود تھا
کیا دلفریب نقش طلسم وجود تھا

آزادگان عشق کی مٹی خراب تھی
جب تک کہ ضبط تابع رسم و قیود تھا

مجھ پہ کچھ ایسا وقت پڑا مختصر یہ ہے
محسود بن گیا ہے جو میرا حسود تھا

وہ نقش بندگی تھا سویدا اسے نہ جان
یعنی جبین دل پہ نشانِ سجود تھا

اب زخم خوردہ دل میں وہ طاقت کہاں رہی
جب آہ کھینچی زور سے چہرہ کبود تھا

اے سوز دل کہاں کی بھری تھی یہ دل میں آگ
جب آہ کر چکا تو میں اک موجِ دود تھا

جب تک کہ آہ کرنے کی ہمت رہی عزیز
یہ آسماں نگاہ میں اک موج دود تھا

عشق رسوا نے نگہ میں جب اثر پیدا کیا
اک تجلی بڑھ گئی اور حسن کا پردہ کیا

رات بھر دیکھا کیا سوئے فلک بیمارِ غم
اس طرف روشن ستارے دل اُدھر ڈوبا کیا

انقلابِ عالمِ ہستی رہا اک رنگ پر
رات دن بدلا کیے نقشے کرہ گھوما کیا

اعتقادِ عشق پہ معنی بڑھانے کے لیے
حُسن نے اک ذرۂ ناچیز کو دنیا کیا

بے حقیقت دل کی ہستی کو وہ سمجھے تھے مگر
اس لہو کی بوند نے عالم تہ و بالا کیا

تھی مری ہستی بھی جب اک قطرۂ دریا نما
کیوں نہ ہم آغوش کر کے پھر مجھے دریا کیا

رات بھر ٹوٹا کیے تارے شب فرقت عزیز
انتہائے ضبط پر بھی آسمان رویا کیا

اب بدنصیب قابل گفتار بھی نہیں
وہ وقت ہے کہ پرسشِ بیمار بھی نہیں

ہے اک فریب ہمت و ناکامیٔ خیال
مشکل جو کام ہے وہی دشوار بھی نہیں

دل میں ہجوم یاس سے اے وائے بیکسی
گنجائش تصور دیدار بھی نہیں

وابستہ عمر سے ہے پرستاریٔ صنم
تار نفس نہیں ہے تو زنار بھی نہیں

بس ہم ہیں اور ماتمِ تنہائیٔ فراق
مدت ہوئی کہ اب کوئی غمخوار بھی نہیں

بازیچہ گاہ عشق میں اس دل پہ حیف ہے
جس میں تصرفِ نگہِ یار بھی نہیں

آخر انھیں بھی آج یہ کہنا پڑا عزیزؔ
تجھ سا ہلاکِ حسرتِ دیدار بھی نہیں

کھلے تھے جس قدر گلہائے رنگیں صحن گلشن میں
زمیں گور غریباں کی لیے ہے ان کو دامن میں

یہ کہہ کر لے لیا دل میرے سینے سے ستم گر نے
تعجب ہے کیا تھا اس کو زندہ دفن مدفن میں

مجسم نقش عبرت ہوں سراپا داغ ہستی ہوں
مفصل دیکھ لو تاریخ دنیا کی مرے تن میں

بتا اے خالق ارض و سما کس کام آئے گی
مری ہستی کہ اک دھبہ سا ہے دنیا کے دامن میں

الجھ کر رہ گیا نظروں میں رشتہ ظلم عالم کا
بسر کی زندگی کی آخری شب ایسی الجھن میں

ثبوت بت پرستی مل گیا خود نقش ہستی سے
رگیں ابھری ہیں یا ہے رشتۂ زنار گردن میں

عزیزؔ سر بزانو وہ زمانہ یاد ہے تجھ کو
پڑی تھیں چاند سی باہیں کسی کی تیری گردن میں

موسیٰ چمک نہیں یہ خط برق طور کی
تیوری چڑھی ہوئی ہے کسی پُر غرور کی

جنبش میں ہے حجاب دلوں میں ہے اضطراب
یہ سب علامتیں ہیں کسی کے ظہور کی

دیکھے بغور کوئی وسیع النظر اگر
صحرائے اعتبار ہے خاک ان قبور کی

افشائے رازِ عشق پہ مجبور ہوں گے ہم
سن کر رہا نہ جائے گا فریاد صور کی

یہ کہہ کے بزمِ وعظ میں اک جام پی لیا
کب تک رکھیں امید شرابِ طہور کی

دریا مہیب رات اندھیری کنارہ دور
کس کو بھلا امید یہاں سے عبور کی

اک بات تھی کہ چبھ گئی دل میں مرے عزیزؔ
بھولوں گا میں ہنسی نہ شکستہ قبور کی

پروفیسر واقف مرادآبادی

مرزا غالب کا بچپن

حضرات کرام حضرت مرزا غالب کی جوانی اور بڑھاپے کے واقعات، سوانح وحالات تو مختلف انداز میں عوام کے سامنے آچکے ہیں لیکن ان کے بچپن کے دور پر مورخین کی عدم توجہی کے پردے پڑے ہوئے ہیں حالانکہ ان کے اس دور طفلی کو زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت تھی تاکہ معلوم ہو جاتا کہ ابتدا سے ان کی افتاد طبیعت کیا تھی اور انھوں نے کیسے ماحول میں پرورش پائی۔ بقول علامہ سعدی

بالائے سرش زہوشمندی　　　می تافت ستارۂ بلندی

آثار بتلا رہے تھے کہ یہ ستارہ اپنی معراج کمال پر مہر نیم روز بن کر اپنی ضیا پاشی سے دنیائے شعر و ادب کو منور کرنے والا ہے۔

اس وقت ان کے بچپن کا وہ دور پیش کیا جا رہا ہے۔ جبکہ وہ یتیم ہو چکے ہیں اور آگرہ میں اپنے مشفق چچا اور پیکر خلوص چچی کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ ابھی مرزا موصوف کا سن تیرہ سال کا ہی تھا کہ اس مجسمۂ مہرو محبت چچی نے یا تو کسی مصلحت و پیش بینی کے تقاضے پر یا افراط محبت میں۔ اپنی بھتیجی امراؤ بیگم سے جن کا سن اس وقت دس گیارہ سال سے زیادہ کا نہیں ہے۔ شادی بھی کر ڈالی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس چودہ پندرہ برس کی عمر میں جبکہ غالب سن شعور کو نہیں پہنچے ہیں۔ ادھر نام نہاد بیگم بھی ناسمجھ اور لاڈلی بچی۔ ایسی حالت میں دو ناسمجھ، چنچل اور شریر بچے ایک گھر میں ہر وقت ساتھ رہتے ہوئے کیا کچھ طوفان نہ برپا کرتے ہوں گے اور لڑائی جھگڑوں کی کیا نوعیت ہو گی۔

مذکورہ واقعات کی ابتدا ۱۸۱۰ء سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

پردہ اٹھتا ہے۔ جو ہیں دید کے طالب دیکھیں　　　دور اول ہے یہ۔ اب طفلیٔ غالب دیکھیں

لیکن معاف فرمائیں ابھی تو یہ مرزا نوشہ ہیں۔ آگے چل کر غالب بنیں گے۔

(پہلا منظر)

مرزا نوشہ (غالب) کی چچی صاحبہ۔ جائے نماز پر۔ نماز سے فارغ ہو کر درود و مناجات میں

مصروف ہیں کہ مرزا نوشہ ہاتھ میں پھٹی ہوئی پتنگوں کا گڈا لیے ہوئے غصہ میں برآمد ہوتے ہیں (لباس۔ بڑی مہری کا ایک برکا پاجامہ، نیچا کرتا، اس پر کلابتونی کام کی صدری افغانی قسم کی)

مرزا۔ دیکھئے! چچی جان۔ میں کہتا ہوں کہ آپ سمجھا دیں اپنی لاڈلی کو۔

چچی۔ ہونہہ۔ ہونہہ۔ خاموشی کا اشارہ تسبیح دکھا کر۔

خادمہ۔ اے کیا ہو گیا ہے۔ چھوٹے میاں۔ سرکار بیگم کی نماز میں تو خلل نہ ڈالیں (آہستہ سے) آٹھ پہر کا اودھم۔

مرزا۔ واہ بوا۔ تم بھی عجیب ہو۔ کیا خلل ڈال دیا ہم نے نماز میں۔ ہم تو صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ اپنی صاحبزادی کو سمجھا دیں ورنہ اچھا نہ ہو گا۔

خادمہ۔ آخر ہوا کیا۔ مجھے تو بتائیے۔

مرزا۔ تمھیں کیا بتائیں۔ تم کرو گی کوئی فیصلہ۔ یہ دیکھو گڈ کا گڈ ہماری پتنگوں کا غارت کر کے رکھ دیا ہے انھوں نے۔

امراؤ بیگم۔ (امراؤ بیگم گڑیا لیے ہوئے جس کی گردن لٹک رہی ہے داخل) انھوں نے! اور ہماری گڑیا کی گردن جو توڑ ڈالی آپ نے تو کوئی بات ہی نہیں۔

مرزا۔ جی ہاں۔ ہم بتائے دیتے ہیں کہ زیادہ لاڈ میں نہ آئیں گی آپ چچی جان کے۔ ورنہ

امراؤ۔ کیا کر لیں گے آپ۔

مرزا۔ کیا کر لیں گے... آپ کی گڑیا کا سارا گھر پھونک کر رکھ دیں گے ہم بھی۔ سمجھیں آپ۔ ہاں۔

چچی۔ توبہ۔ توبہ۔ خدا کی پناہ۔ نماز پڑھنا دوبھر کر دی۔ ابھی سے تم لوگوں کے لڑائی جھگڑوں کا یہ عالم ہے تو یقین ہے کہ بڑے ہو کر تو گھر کو پانی پت کا میدان بنا ڈالو گے تم لوگ۔

مرزا۔ مگر دیکھیے تو چچی جان۔

امراؤ۔ پہلے میری بات سنیں پھوپی جان۔

مرزا۔ چپ رہیے پہلے ہمیں کہنے دیں۔

امراؤ۔ جی نہیں پہلے میں کہوں گی۔

چچی۔ مگر قیامت کیا ہے۔ آخر مصیبت کیا آئی ہے دشمنوں پر۔ یہ تو معلوم ہو۔

مرزا۔ اے یہ دیکھیے۔ کل ہی ہم یہ پتنگیں لائے تھے۔ راجہ بلوان سنگھ سے آج کے پیچ لڑانے کے لیے۔ گھنٹوں میں نفیس کانپ ٹھڈوں والی چھانٹی تھیں ہم نے۔ سب غارت کر کے رکھ دیں

ان لاڈلی صاحبہ نے۔

پچی - کیوں بھئی امراؤ بیگم یہ کیا کیا تم نے۔ سچ تو ہے ساری کی ساری غارت کر دیں۔

امراؤ - تو انھوں نے ہماری گڑیا کی گردن کیوں مروڑی۔

مرزا - مگر ان سے ذرا یہ تو پوچھیے کہ پہلے انھوں نے پتنگیں پھاڑیں یا ہم نے گڑیا کی گردن ناپی۔

امراؤ - اور کل کی بھول گئے۔ گڑیا کے ڈولے کی تیلی گھسیٹ کر جو اپنی چرخی میں ڈال لی اور سارا ڈولا اجاڑ کے رکھ دیا۔

مرزا - مگر پرسوں جو ہمارے کبوتروں کے انڈے توڑے آپ نے۔

امراؤ - تو پھر ہماری بلی کے لکڑی کیوں ماری تھی آپ نے۔

پچی - خدا کی پناہ۔ کوئی ٹھکانا ہے جرموں کی فہرست اور شکایتوں کے دفتر کا۔ مرزا نوشہ میرے لال۔ تم تو سمجھ دار ہو۔

مرزا - اپنی ان سے کچھ نہیں کہتی ہیں آپ۔ بس ...

پچی - تنک مزاجی بڑی بری بات ہے میرا چاند۔ جتنے چاہو اور دام لے جاؤ۔ اور پتنگیں لے آؤ ابھی تو کافی وقت ہے۔ اور ہاں خبردار امراؤ بیگم اگر آئندہ تم نے کبھی ان کی کسی چیز کو خراب کیا یا چھوا۔

امراؤ - تو پھر ان سے بھی کہہ دیجیے کہ ہماری چیزیں بھی نہ چھوا کریں۔

مرزا - دیکھیے پھر وہی ...

پچی - اچھا۔ تم جاؤ یہاں سے امراؤ بیگم۔

امراؤ - واہ پھوپی جان اچھا فیصلہ کیا آپ نے بھی۔ ان کو تو دام دیے جا رہے ہیں، اور ہمارا جو اتنا بھاری نقصان کر دیا انھوں نے۔

پچی - جی آپ کے نقصان کا تاوان بھی ہم بھرنے کو تیار ہیں۔ کہیے کیا چاہیے۔

امراؤ - اب بھلا ہم کیا بتائیں۔ کم سے کم ایک روپیہ تو دیدیجیے۔ بی مغلانی سے نئی گڑیا بنوانی ہے پھر اس کا زیور کپڑا سب کچھ ہی کرنا ہے۔

مرزا - اجی پچی جان آگ لگائیے ان کی گڑیوں کو۔ وہ روپیہ بھی ہمیں دیدیجیے۔ مانجھے کے لیے دام کم پڑیں گے۔

پچی - بھئی تمھیں دنیا بھر کے لین دین سے کیا واسطہ۔ جو تمھیں ضرورت ہے وہ تم لے لو۔ جھگڑا

کیوں بڑھاتے ہو۔

مرزا۔ جھگڑے کی تو ہماری عادت ہی نہیں چچی جان

چچی ۔ اے بالکل نہیں۔ ہمارا مرزا نوشہ ایسا نمانا اور بے زبان تو کہیں ڈھونڈے نہ ملے بشریٰ کہیں کے۔ لو بھئی امراؤ بیگم تم تو اپنا روپیہ سنگوڑو اور سواری بڑھاؤ۔

مرزا۔ اچھا پھر لائیے ہمیں بھی۔

چچی ۔ تم بھی لے لو ایک روپیہ۔

مرزا۔ سبحان اللہ۔ کیا کہنے حضور۔ خیر آپ صرف پانچ ہی عنایت فرمادیں۔ واللہ چچی جان آج تو بڑے کانٹے کے پیچ ہوں گے راجہ سے۔ وہ بھی کیا یاد کریں گے۔ آج تو آپ بھی دیکھیں ہمارے پیچ محل سرائے کی چھت سے۔

چچی ۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مجھے اور کام ہی کیا ہے۔ دن بھر تم لوگوں کے پیچ ہی تو دیکھا کرتی ہوں۔

مرزا۔ اچھا اب روپے عنایت ہوں۔ اب پھر چھانٹنا پڑیں گی پتنگیں۔ وقت کم۔ کام زیادہ۔ ابھی مانجھا بھی دیکھنا ہے۔

آواز۔ ارے بھئی مرزا نوشہ صاحب

مرزا۔ اچھا اعظم بھائی ہم ابھی آئے۔ لائیے بس پانچ میں ہی کام چلالیں گے۔

چچی ۔ بڑے تیز ہو۔ خیر لو۔ پانچ ہی لو ... بس۔

مرزا۔ پانچ کا مطلب بھی سمجھیں آپ۔

چچی ۔ اب اتنی سمجھ کہاں سے لاؤں۔

مرزا۔ تو سنیے جو بات ہے ہماری وہ پنجتن بنائیں ۔ دشمن ہی مات کھائے ہر پیچ یوں لڑائیں

چچی ۔ اب تو ماشاء اللہ پورے شاعر بنتے جارہے ہو۔ چھوڑو نہ پتنگ بازی کا دھندا۔ شاعری میں ہی دل لگاؤ۔

مرزا۔ جی۔ تو گزارش ہے حضور شاعری کو بڑا زمانہ ہے۔ ابھی بچپن کا کارخانہ ہے۔ آداب بجالاتا ہوں۔ اچھا اجازت ہے۔ کامیابی کی دعا فرمائیں۔

چچی ۔ بڑی مہم پہ جارہے ہیں نا۔

مرزا۔ کچھ ایسی ویسی مہم حضور آبرو یاں پہ بڑھتی گھٹتی ہے۔ ساتھ گڈی کے ناک کٹتی ہے۔ قسم اڑان پیر کی۔

چچی۔ جاؤ۔ خدا حافظ۔ مولا کی مدد.... امراؤ بیگم۔ ذرا ادھر تو آنا۔
امراؤ۔ جی آئی.... فرمائیے۔
چچی۔ دیکھو اب ہم سمجھاتے ہیں۔ بڑی بُری بات۔ مرزا کی کسی چیز کو خراب نہ کیا کرو۔
امراؤ۔ تو پھر وہ ہماری چیزیں کیوں....
چچی۔ بھولی لڑکی یہ نہ بھولو کہ مرزا تمھارے میاں ہیں اور تم ان کی بیگم۔ ہزار بار سمجھایا لیکن تم...
امراؤ۔ جی ہم نہیں بنتے کسی کی اکیگم بیگم۔
چچی۔ وہ تو بن چکیں اور دھوم دھڑکے سے۔ اب کیا ہوتا ہے۔ لڑا نہ کرو۔ بُری بات (پیار کرتے ہوئے)

دوسرا منظر۔ راستہ

مرزا۔ تمھاری قسم اعظم بھائی۔ ہم کوئی دبنے والے ہیں تمھارے ان راجہ سے پچھلے مقابلہ میں ہی ہم نے دانت کھٹے کر دیے تھے ان کے۔ آج پھر دیکھنا اگر ساری سے راجہ صاحب کے کنّے نہ جھاڑ دیے تو مرزا نوشہ نام نہیں۔
اعظم۔ بھئی مرزا بات تو جب ہے کہ آج بھی نوشیرواں اُترے۔
مرزا۔ انشا اللہ (ہاتھ پر ہاتھ مار کر) دب کے رہتے نہیں ہم فضل الٰہی سے کبھی۔ ان کو بالا نہ پڑا ہو گا سیاہی سے کبھی۔
اعظم۔ بیشک۔ آخر ہو نا صاحبان سیف کی یادگار۔ اور یہ شعر تو خوب کہا ہے۔ کیا برجستگی اور طراری ہے۔ میاں نظیر کے شاگرد جو ٹھیرے۔
مرزا۔ میاں نظیر کے شاگرد۔ بھائی ان کی شاگردی سے تو انکار نہیں۔ وہ ہمارے استاد ضرور ہیں مگر شاعری میں نہیں۔
اعظم۔ تو پھر۔
مرزا۔ صرف کریما، مامقیما، خالق باری۔ گلستاں و بوستاں وغیرہ کے۔
اعظم۔ تو پھر شاعری میں کس کے شاگرد ہوئے۔
مرزا۔ اللہ میاں کے۔
اعظم۔ مذاق نہیں۔ سچ بتاؤ۔
مرزا۔ مذاق نہیں۔ کیا یہ مقولہ نہیں سُنا کہ شاعری، مصوری اور موسیقی قدرت کا عطیہ ہے

جس کو بھی مل جائے۔ یہ فن سیکھنے سکھانے کے نہیں ہوتے بلکہ ؎

جبکہ بندہ پہ کرم حق کا سوا ہوتا ہے   کسی فن کار سے انعام عطا ہوتا ہے

یا یوں سمجھیں ؎

فطرت جو ہے شاگرد تو قدرت استاد   سب کمالات کی ہے حق کے کرم پر بنیاد

اعظم۔ بہت خوب ... مگر اب آگے کہاں بڑھے جا رہے ہو۔ کیا بارہ دری کی چھت سے پینچ لڑانے کا ارادہ نہیں ہے آج۔

مرزا۔ نہیں وہی پرانا اڈہ۔ کٹرے والی چھت۔ دور تک کھلی جگہ۔

آغا۔ صاحبزادہ۔ کیا آپ بتائیں گا۔ اس شہر کا کارواں سرائے۔ یا مسافر ٹھیرنے کا مقام۔ کدھر اور کتنا دوری ہے۔

اعظم۔ سرائے تو قریب ہی ہے مگر بہت خراب اور گندی۔

مرزا۔ معاف کیجیے گا آغا صاحب۔ شاید آپ کہیں باہر سے تشریف لائے ہیں۔ غالباً عراق یا ایران سے۔

آغا۔ بلے بلے۔ جی۔ آپ ٹھیک سمجھا۔ ام۔ آدم ایران ہستیم۔

مرزا۔ اچھا تو آپ ایرانی ہیں۔

آغا۔ آں۔ ام ایران سے ادھر آیا۔

اعظم۔ تو آپ ایران سے ایں جا کب تشریف لایا۔

مرزا۔ عرض میشود کہ جناب آغا دریں دیار کے وارد شدہ و برائے چہ۔

آغا۔ الآن می آیم۔ برائے سیر و تفریح مملکت ہندوستان

مرزا۔ ہندوستان کی سیر کو آئے ہیں (اعظم سے)

آغا۔ ماشاء اللہ۔ شما کہ بزبان فارسی مزاولت تامّہ دارید۔ خیلے خوش دل شدم۔ اسم فرزند گرامی

مرزا۔ مرزا نوشہ

آغا۔ این کہ عرفیت شما باشد نہ کہ اصل اسم

مرزا۔ بلے بلے۔ اسم بندہ مرزا اسد اللہ بیگ ہست

آغا۔ ماشاء اللہ۔ زندہ باد۔ خوش باش

اعظم۔ اب تم ان کا نام بھی تو معلوم کرو۔

مرزا۔ واسم جناب آقائے محترم۔
آغا۔ اسم بندہ ملائے عبدالصمد۔ واسم سابقہ من۔ ہرمز بودہ
اعظم۔ کیا مطلب۔
مرزا۔ مقصد سابق نہ فہمیدم
آغا۔ اولاً مجوسی بودیم۔ آتش پرست کرا پارسی می گویند۔ چند سال میشود کہ مشرف باسلام شدیم ازیں جہت
اعظم۔ کیا بولے۔
مرزا۔ پہلے یہ آتش پرست پارسی تھے تو نام ہرمز تھا اور اب کچھ برس ہوئے یہ مسلمان ہو گئے او عبدالصمد نام رکھ لیا۔ تا چند قصد قیام دریں بلدہ دارید۔
آغا۔ سوال قیام بہ کاروانسرائے حیات چندیں باشد۔ چندے قیام میکنم۔ باز میروم۔
اعظم۔ بھئی ہمیں بھی تو سمجھاؤ کیا فرمایا۔
مرزا۔ میں نے معلوم کیا کہ یہاں آپ کا کب تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے تو فرماتے ہیں بس کچھ دنوں قیام ہوگا اور کیا۔ آقایم تکلف برطرف اگر خلاف مزاج وحالات نہ باشد۔ غریب خانہ بندہ تمنائے التفات دارد۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اگر تکلف نہ ہو تو قیام کے لیے غریب خانہ موجود ہے۔
آغا۔ فرزند گرامی قدر خیلے ممنون شدم از علوے اخلاق والتفات شما کہ بحق من غیر متعارف مسافر روا داشتہ۔ الا دریں امر استمزاج بزرگان شما لازم می باشد۔ نشود کہ خلاف مزاج ایشاں باشد۔
مرزا۔ فرماتے ہیں کہ ایسے امور میں تمھارے بزرگوں کی رضامندی پہلا کام ہے۔ تو میں بتائے دیتا ہوں کہ میں اپنے گھر کا مختار ہوں۔ ہے نا۔
مرزا۔ آقائے محترم شما دریں امر یک خوردہ۔ تامل نہ فرمایند۔ آنچہ عرض میشود بخدمت گرامی منزلت بہ اعتبار اختیار کلی بندہ است۔ احتیاج استمزاج کسے نیست باور کنید۔
آغا۔ اگر چنین است۔ بسم اللہ در کار خیر۔ حاجت ہیچ استخارہ نیست۔
مرزا۔ خیلی ممنون فرمودی۔ اعظم بھائی۔ آپ آغا صاحب کو ساتھ لے جائیں۔ اور مردانی حویلی میں مشرق رویہ کمرے میں آپ کو ٹھہرا دیں اور بندو سے کہہ کر جملہ وقتی ضروریات کا انتظام کرا دیں۔ پھر ہم خود آن کر سب کچھ انتظام کر لیں گے۔ بسم اللہ تشریف ببرید۔ حالا من کہ کار ضروری دارم بعد الفراغ زود تر حاضر خدمت اقدس میشوم۔ الان معاف دارید وہیچ۔
آغا۔ باکے نیست۔ بہ امان خدا۔

تیسرا منظر۔ محل

(مرزا کی چچی ایک تخت پہ گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی ہوئی چھالیہ کاٹ رہی ہیں سامنے سفید چاندنی پہ پاندان کھلا ہوا ہے)

خادمہ۔ (خادمہ داخل ہو کر) لیجیے سرکار بیگم صاحبہ مبارک۔ حضور کے بھائی جان حضرت نواب صاحب تشریف لے آئے۔

چچی۔ ایں۔ کون سے بھائی جان۔

خادمہ۔ اے وہی دلی والے۔ سرکار دلہن بیگم کے ابا جان۔ اللہ سلامت رکھے۔ رتھ سے سامان اُتروا رہے ہیں۔

چچی۔ تو پھر یہ بندہ وغیرہ کہاں ہیں؟

خادمہ۔ بندہ بازار گیا ہے۔

چچی۔ اچھا۔ امراؤ بیگم۔ بیٹا کہاں ہو۔

امراؤ۔ جی پھوپی جان (داخل ہوتے ہوئے)

چچی۔ لو بھئی ہم نے تمہارے ابو جان کو بلوا دیا دلی سے۔

امراؤ۔ تو کہاں ہیں وہ

چچی۔ باہر مردانے میں۔ ابھی تشریف لاتے ہیں۔

نواب۔ ارے بھئی امراؤ بیگم۔

خادمہ۔ اے لیجیے تشریف لے آئے سرکار۔ آئیے حضور

چچی۔ تسلیم بھائی جان۔

امراؤ۔ آداب ابو جان

نواب۔ آداب تسلیم۔ جیو۔ کہو بھئی ویسے سب خیریت تو ہے۔

چچی۔ شکر ہے پروردگار کا سب ٹھیک ہیں۔

نواب۔ اور تم کہو امراؤ بیگم۔ تم خوش تو ہو۔ یہاں اپنی پھوپی جان کے پاس۔

امراؤ۔ جی ہاں۔ مگر۔ وہ ہم سے بہت لڑتے ہیں۔

چچی۔ خاموش رہو۔

نواب۔ کون۔ کیا۔
بچی ۔ کچھ نہیں بچوں والی بات۔ مرزا نے انتقام میں ان کی گڑیا کی گردن توڑ دی جبکہ پہلے انھوں نے ان کی پتنگیں خراب کیں۔ خیر چھوڑئیے۔ دلی سے آپ کب چلے تھے۔ ویسے راستہ تو خیریت سے طے ہوا۔
نواب۔ وہاں سے چلے تو آج چھٹا روز ہے۔ راستہ میں متھرا میں ایک دوست نے روک لیا ایک دن کے لیے۔ ویسے سفر بڑے آرام سے طے کیا۔
بچی ۔ ویسے دلی میں تو سب خیریت ہے۔ لوہارو کے کیا حالات ہیں۔
نواب۔ ہر طرح خیریت ہے اور سب ٹھیک ہیں۔ اور ہاں مرزا نوشہ کہاں ہیں۔
بچی ۔ جی۔ وہ۔ آج ان کے پتنگوں کے پیچ ہیں راجہ بلوان سنگھ سے۔
نواب۔ تو کیا انھیں بچوں اور کھیل کود میں ہی ان کی عمر گنوانا ہے۔ یہاں وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ انھیں ہمارے پاس دلی بھیج دو۔
بچی ۔ لیکن بھائی جان انھیں بچوں سے تو میری زندگی ہے۔ ان کو کیسے جدا کر سکتی ہوں۔
نواب۔ تو تم بھی وہیں چلو نا۔
بچی ۔ جی درست۔ تو پھر یہاں کا یہ سارا کھٹراگ کون سنبھالے گا۔ اچھا پہلے ضروریات سے تو فارغ ہو جائیں۔ پھر کچھ نوش فرمائیں باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔
نواب۔ بھئی خالی ہاتھ منھ دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ غسل ہی کر ڈالیں۔ راستہ کی خاک میں اٹے ہوئے ہیں۔
بچی ۔ ہاں غسل ضرور فرمالیں۔ تکان سفر بھی دور ہو جائے گی۔ ابھی پانی گرم ہوا جاتا ہے
خادمہ۔ (خادمہ داخل ہوکر) لیجیے کچھ اور سنا حضور بیگم صاحبہ
بچی ۔ کیا ہوا۔
خادمہ۔ وہ چھوٹے سرکار نے کسی آغا صاحب کو بھیجا ہے مردانے میں ٹھہرانے کو۔ اعظم میاں ساتھ آئے ہیں انتظام کے لیے۔
نواب۔ کون آغا صاحب۔
بچی ۔ بھلا میں کیا جانوں۔
خادمہ۔ تو پھر کیا حکم ہے حضور کا۔

چچی - حکم کا ہے کا۔ مرزا کے وہ کوئی جاننے والے ہی ہوں گے۔ ان کا خیال رکھو اور بندو سے کہہ دو کہ ان کا سامان قاعدے سے رکھوا دے اور جس چیز کی ضرورت ہو وہ فراہم کر دے۔ اور ہاں سدا بہار سے کہو کہ جلدی سے پانی گرم کر دے بھائی جان کے غسل کے لیے۔

نواب - لیکن ان آغا صاحب کو تو دیکھا جائے۔ کون ہیں کس قماش کے۔ کہاں سے آئے ہیں۔ مرزا سے کب کی شناسائی ہے۔

چچی - جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ مرزا کسی ایسے ویسے کو تو منہ لگانے والے نہیں۔

نواب - پھر بھی... ہم ابھی آئے۔ اتنے پانی گرم ہوتا ہے۔ (جاتے ہیں)

چچی - اور ہاں امراؤ بیگم۔ کیا شکایت کرنے چلی تھیں۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔ کوئی بیگم اپنے میاں کی برائی کرتی ہے کسی کے سامنے۔

امراؤ - تو پھر وہ اتنا کیوں ستاتے ہیں۔ ہماری ساری چیزیں غارت کرتے ہیں۔

چچی - تم خود کیا کچھ کم ہو۔ سیر کو سوا سیر جواب دینے والی۔

امراؤ - تو پھر بھیج دیجیے ہم کو ہمارے ابو جان کے ساتھ دلّی۔

چچی - اچھا تو کیا ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤگی۔ ایں۔ اور ہم جو اکیلے رہ جائیں گے۔ اس کا بھی خیال نہیں۔ واہ بیٹا۔

نورن (ایک عورت داخل ہو کر) دہائی ہے سرکار بیگم صاحبہ کی۔

چچی - کیوں۔ کیا ہے نورن۔ کیا بات ہے۔

نورن - یہ دیکھیں حضور۔ کیسا لہو لہان کیا ہے میرے بچے کو چھوٹے سرکار نے۔

چچی - اے یہ کیوں۔

نورن - کل اس کمبختی کے مارے نے ایک کبوتر پکڑا تھا گھر کی منڈیر سے۔ آج یہ کہیں شامت کا مارا اس کبوتر کو لے کر باہر گیا۔ راستہ میں مل گئے وہ اور کہنے لگے کہ ابے چوہے یہ کبوتر تو ہمارا ہے اور پھر جو اس کا آدھا بنایا ہے وہ دیکھ لیں حضور۔ ہم غریب ہیں اور حضور کی رعایا مگر...

چچی - بلا وجہ تو وہ کسی کے سر ہونے والے نہیں۔ کبوتر ضرور انھیں کا ہو گا۔

نورن - انھیں کا ہو گا۔ مانا۔ مگر اس بیدردی سے ایک بچے کو مارنا حضور...

چچی - خیر۔ انھیں آنے دو۔ ہم پوچھ لیں گے۔ ہلدی چونا گرم کر کے اس کے لگا دو۔ اور دودھ میں پھٹکری ڈال کر اسے پلا دو گرم گرم۔ لے لڑکے یہ پیسے لے۔

نورن۔ اے حضور اس کی کیا ضرورت ہے۔
پچی۔ ارے سنتا نہیں۔ یہ لے پیسے لے۔ دودھ لے آنا۔
نورن۔ لے لے چھدو۔ سلام کرکے۔ ہم تو رعایا ہیں اور یہ ہماری سرکار۔ چل۔
نواب۔ کہو بھئی ہو گیا پانی گرم۔
پچی۔ جی ہاں پانی تیار ہو گیا ہوگا۔
نواب۔ ہم مل آئے ان آغا صاحب سے۔ مرزا تو ایک ہیرا ڈھونڈ کرلے آئے ہیں۔ ایرانی ہیں وہ۔ ایک بڑا عالم۔ فاضل اور جید شاعر۔ عبدالصمد نام ہے۔ پہلے آتش پرست تھے اور ہرمزنام تھا۔ اب مسلمان ہو گئے ہیں۔ کتنا اچھا ہو اگر سال چھ مہینے کے لیے ان کو کسی طرح روک لیا جائے تو مرزا ان سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔
پچی۔ ممکن ہے کہ مرزا ان کو اسی خیال سے گھیر کرلے آئے ہوں۔
نواب۔ آدمی بڑا نیک اطوار اور جید عالم ہے۔ اب کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ کچھ عرصہ یہاں ٹھہر جائیں۔
مرزا۔ لیجیے مبارک چچی جان۔ کھلوائیے مٹھائی اور دلوائیے انعام۔ اتار دیا ہم نے آج بھی نوشیرواں، اور پھر آناً فاناً۔ جو راجہ نے بڑھائی وہ کاٹ گرائی۔ اور۔ ارے ابا جان آداب۔ آپ کب تشریف لائے۔ میں نے دیکھا بھی نہیں۔
نواب۔ آج۔ اور ابھی۔ کہیے کیسے رہے آج کے پیچ۔ خیر وہ تو ہم سمجھ گئے لیکن یہ نوشیرواں کا معاملہ بالکل نہیں سمجھے۔
مرزا۔ جی حضور نوشیرواں کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ایک پتنگ چڑھا کر اس سے حریف کی نو پتنگیں پے درپے کاٹ کر اپنی پتنگ سلامت اتار لیں۔
نواب۔ خوب۔ عجیب اصطلاح ہے یہ بھی۔ اور ہاں یہ آغا صاحب کہاں سے ہاتھ لگ گئے تمھارے بڑے جید عالم ہیں۔
مرزا۔ اتفاق کی بات وہ کارواں سرائے کا پتہ معلوم کر رہے تھے۔
نواب۔ خوش قسمت ہو بیٹا۔ بڑا قیمتی ہیرا ہاتھ لگا ہے تمھارے۔ اگر اس سے کچھ حاصل کر لو تو زندگی سنور جائے۔
مرزا۔ خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے بشرطیکہ وہ کچھ عرصہ ٹھہر جائیں یہاں۔
نواب۔ یہ سب کچھ تو تمھارے اختیار اور طور طریق پر منحصر ہے۔ اگر ہر طرح ان کی راحت رسانی کا خیال رکھو گے۔ خاطر مدارات سے پیش آؤ گے تو ضرور ٹھہر جائیں گے۔

پھچی - اورہاں مرزا نوشہ بیٹا۔ تم نے اس غریب نورن کے لڑکے چھدو کو کیوں مارا اور پھر ایسا کہ توبہ بھلی۔
مرزا - اجی وہ تو کہیے چھوڑ دیا ہم نے۔ ورنہ اس مردود کو تو جہنم رسید کر ہی دینا تھا۔
پھچی - آخر کس قصور پر۔
مرزا - چور ہے کمبخت۔ اب تک ہمارے نہ جانے کتنے کبوتر دھابڑی سے نکال لے گیا اور بیچ ڈالے۔ ہم حیران تھے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ آج پکڑا ہم نے بچہ کو رنگے ہاتھوں اور کر دیا مزاج درست۔
پھچی - جانے دیا ہوتا۔ غریب کا بچہ
مرزا - غریب کے بچے کو تو اور زیادہ سدھارنے کی ضرورت ہے۔ اچھا اب اجازت دیں۔ میں ذرا باہر جا کر آغا صاحب کی خیر خبر لوں۔
نواب - ہاں ہاں ضرور - بہت زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ جاؤ اتنے ہم غسل سے فارغ ہو لیں۔ پھر کھانا ہم بھی باہر ہی کھائیں گے۔ تم ان کا انتظام کرو۔
مرزا - بہتر۔

چوتھا منظر - راستہ

استاد - میں نے کہا۔ چھوٹے سرکار۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔
مرزا - اوہ۔ استاد چھٹن خاں کہیے کیسے بھول پڑے آج ادھر۔
استاد - حضور سلامت رہیں۔ یہ تو غلام کا چوتھا پھیرا ہے۔
مرزا - کیوں۔ خیریت تو ہے۔
استاد - مولا کے کرم سے سب خیریت ہی ہے۔ اللہ نے آپ کو ابھی سے ایسا کمال اور ہنر دیا ہے کہ اچھے اچھے منھ تکتے رہ جائیں۔ آپ کی غزلیں تو قیامت ڈھاتی ہیں حضور۔ یہ کوئی منھ دیکھی بات نہیں وہ اس روز والی غزل تو اتنی کامیاب رہی کہ محفل جھوم اٹھی۔ کیا بات ہے حضور کی۔
مرزا - ہوں۔
استاد - اس لیے اب دوسری غزل کی فرمائش ہے ان کی
مرزا - بھئی ہم کوئی شاعر تو نہیں۔ اور پھر اتنی فرصت کہاں ہمیں۔
استاد - نہیں میرے سرکار یوں کام نہیں چلے گا۔ غزل تو حضور کو عنایت فرمانا ہی ہوگی۔ کلیان بائی

ے کانٹے کی بات آن پڑی ہے حضور۔ ذرا کسی وقت تشریف لاکر اپنی غزل تو سن لیں ان سے حضور۔ سونے پہ سہاگہ۔ ایک تو غزل قیامت کی اس پہ آواز کا جادو۔ نہ پوچھیے کیا رنگ ہے۔ طبیعت بحال ہو جائے گی حضور کی۔ ہاں اللہ سلامت رکھے۔

مرزا۔ بھئی ایک تو یہ بات کہ ہمیں ایسی جگہ جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو پھر کتنی بدنامی ہوگی ہماری اور لوگ کیا کہیں گے۔

استاد۔ واہ حضور۔ وہاں تو بڑے بڑے نواب۔ راجہ۔ شاہزادے۔ رئیس زادے حاضری کی تمنّا کرتے ہیں۔ حسن کی سرکار جو ٹھہری حضور۔

مرزا۔ بھئی ہمیں کسی سرکار سے کیا واسطہ۔ وہ اس دن تو ہم اعظم بھائی کے کہنے اور تمھارے اصرار سے مجبور ہو کر چلے گئے تھے تھوڑی دیر کو۔

استاد۔ مگر سچ فرمایئے گا۔ طبیعت خوش ہوئی یا نہیں۔

مرزا۔ ہاں اچھا گاتی ہیں۔

استاد۔ تو بس آج کسی وقت کرم ہو جائے حضور کا۔ واللہ لطف آجائے گا اپنی غزل سُن کر۔

مرزا۔ نہیں بھئی استاد آج تو ہم کسی طرح نہیں آسکتے۔ دہلی سے ہمارے ابا جان آئے ہوئے ہیں ہم کہیں نہیں جاسکتے۔ کچھ دنوں کے بعد غور کریں گے۔

استاد۔ تو پھر حضور یہ کاغذ تو لے لیجیے۔ اس میں وہ بات لکھی ہے کہ غزل کس غزل پہ لکھی جائے گی۔ آپ پڑھ لیں اسے تو پھر میں آج کے دن ہی آؤں گا۔

مرزا۔ اچھی بات ہے۔ دیکھا جائے گا۔

پانچواں منظر

مرزا۔ سلام علیک۔ حضرت آقائے محترم۔

آغا۔ علیک السلام۔ کیست۔ وہ۔ مرحبا۔ فرزند گرامی قدر۔ خیلے ممنون فرمودی از میزبانی خود چند دقیقہ میشود کہ بہ حضرت نواب صاحب ملاقی شدم۔ او خودش تشریف ارزانی فرمودہ ماشاءاللہ حضرت نواب خودش صاحب کمال و شاعر شیریں مقال است۔

خادمہ۔ (خادمہ کچھ خواکہات و شیرینی لے کر حاضر ہوتی ہے) حضرت آغا صاحب کنیز سلام عرض کرتی ہے۔

آغا۔ کیست وچہ گفتہ۔ (مرزا سے)

مرزا۔ کنیز خانہ۔ سلام و کورنش میگذارد بحضور جناب آقا۔

آغا۔ خوش باشد۔

خادمہ۔ چھوٹے سرکار اب آپ ان کی زبان میں کہہ دیں کہ سرکار بیگم صاحبہ بھی سلام عرض کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ اب آپ یہیں قیام فرمائیں اور اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھیں۔ اس لیے کہ وہ چھوٹے سرکار کو آپ کی شاگردی میں دینا چاہتی ہیں۔

آغا۔ آلان چہ گفتند۔

مرزا۔ یک پیغام حضور عالیہ عمہ مکرمہ آوردہ

آغا۔ وضاحت کنید۔

مرزا۔ حضرت عالیہ بعد ہدیۂ سلام ارشاد فرمودہ کہ آقائے محترم غریب خانہ را کاشانۂ خود شمردہ، باطمینان تمام قیام فرمایند۔ زیرا کہ خواہش و درخواست عمۂ مکرمہ نیز اینست کہ بندہ را کفش برداری گرفتہ بہ شاگردی خوش مفتخر فرمایند۔

آغا۔ واللہ خوش بختیِ خویش می شمارم کہ یک گوہر شب چراغ کہ بصورت فرزند گرامی جانم مرزا نوشہ پیش نظرم است از کنز ربانی یافتم۔ بجان و دل قبول کردم۔

مرزا۔ شکر گذار ہستم۔ جاؤ چچی جان کو مبارکباد پیش کردو کہ حضرت آغا صاحب نے مجھے اپنی شاگردی میں لے لیا ہے۔

آغا۔ بلے مبارک باشد ہمہ را۔ سلام تکریم بندہ بحضور علیہ رسانیدہ شود کہ از جادۂ اطاعت بیرون نیم۔

مرزا۔ سمجھیں بوا۔ چچی جان سے آغا صاحب کا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ وہ فرماتے ہیں کہ میرے لیے جیسا حکم ہوگا وہ میں بخوشی بجالاؤں گا۔

آغا۔ نیز بگوئید کہ بندہ آں زمان را بہ چشمِ تصور و قیاس ملاحظہ می کند کہ حضرت مرزا نوشہ یکے از سربرآوردگان ملک ہند شمردہ می شود۔ و ہر یگانہ و بیگانہ او را بہ نگاہ توقیر و مرتبت می نگرد۔

مرزا۔ اور یہ بھی کہہ دو کہ حضرت آغا صاحب فرماتے ہیں کہ میں یقین کرتا ہوں اور وہ زمانہ میرے تصور میں ہے جبکہ میرا شاگرد مرزا نوشہ ہندوستان کے نامور لوگوں میں شمار کیا جاتا ہوگا۔ این ہمگی ذرہ نوازی حضرت آقائے محترم و منتہائے شفقت است۔

آغا۔ رفیق شما کجا رفتہ۔ او کہ مرا اینجا رسانیدہ۔ چہ اسم دارد۔

مرزا۔ اعظم خاں۔ آلان می آید ۔ ۔ ۔ او۔ یادش بخیر۔ اعظم بھائی آغا صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔
اعظم۔ میں حاضر ہستم
آغا۔ بفرمائید
مرزا۔ حکم ہوا ہے تشریف رکھیے۔
آغا۔ چیزے می پرسم۔ شما از شعر گوئی ہم قدرے شغف دارید۔ چنان قیاس کردم
اعظم۔ کیا پوچھا۔
مرزا۔ دریافت فرماتے ہیں مجھ سے کہ کیا تمھیں کچھ شاعری سے بھی شوق ہے۔ میرا ایسا قیاس ہے۔
اعظم۔ آغا صاحب این شاعری تو خوب ست۔ میرا مطلب ہے کہ بڑے اچھے شعر کہتے ہیں شاعر ہیں مرزا۔
آغا۔ تو ہم غلط قیاس نہیں کرتا۔ ٹھیک ہے نا۔
مرزا۔ جی یونہی کچھ تک بندی کر لیتا ہوں یعنی کہ مصرعہ موزوں می توانم کرد کمکے۔
آغا۔ تخلص چہ می کنید۔
مرزا۔ اسد
آغا۔ بلے۔ درست چرا کہ اسم شما اسد اللہ بیگ ہست ازین جہت مناسب باشد۔ الّا چیزے دیگر ہم ہست۔
مرزا۔ آن چہ
آغا۔ چرا جزاول را اختیار کردہ و جز ثانی را ترک گردانیدہ
اعظم۔ کیا کہا۔
مرزا۔ فرماتے ہیں کہ تم نے پہلا حصہ تو لے لیا اور دوسرا حصہ چھوڑ دیا۔ نہ فہمیدم حضرت عالی تصریح فرمائید۔
آغا۔ نمیدانی۔ کہ لقب جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام اسد اللہ الغالب ہست۔ غالب کل غالب علی ابن ابی طالب۔ بحمد اللہ کہ اسم شما اسد اللہ ہست پس لازم افتد کہ غالب باشید۔
مرزا۔ فرماتے ہیں جب تمھارا نام بھی اسد اللہ ہے تو پھر نام کا دوسرا حصہ غالب کیوں ترک کرتے ہو کیونکہ مولی علی کا نام و لقب اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب ہے اس لیے تخلص غالب ہی ہونا چاہیئے۔ انشا اللہ بہ تکمیل منشائے عالی کوشاں می شوم۔ مگر ایک الجھن گلے ڈال دی آغا صاحب نے۔
اعظم۔ وہ کیسی۔

مرزا۔ اعظم بھائی شاعری میں بعض اوقات بڑی مصیبت پڑتی ہے تخلص کھپانے میں۔ بعض آڑی ترچھی بحروں میں دشواری پڑجاتی ہے ۔حضرت والا۔ معاف دارید۔ بہ التزام اسم غالب یک خوردہ دشواری می افتد بعض اوقات باعتبار اختلاف بحور۔

آغا۔ باکے نیست اسد راہم روا دارید۔ الا غالب باید کہ غالب باشد بہ کلام شما۔

مرزا۔ انشاءاللہ آلان قدرے آرام فرمائید۔ بار خاطر آیم۔ اجازت است۔

آغا۔ بلے خوش باش۔

اعظم۔ میں بھی اجازت چاہوں گا۔

آغا۔ خدا حافظ۔

اعظم۔ اب کیا ارادہ ہے ٹہلنے نہیں چلو گے کیا۔

مرزا۔ اعظم بھائی۔ وہ استاد چھٹن نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آج پھر وہیں چلنے کا تقاضا ہے ان کا

اعظم۔ وہ میرے پاس بھی آئے تھے۔ اور مجھ سے بھی زبردستی وعدہ لے لیا ہے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ تم بھی وعدہ کر چکے ہو۔

مرزا۔ مگر ہمیں تو شرم آتی ہے وہاں جاتے ہوئے۔ کسی نے دیکھ لیا تو کتنی بُری بات ہے۔

اعظم۔ بھئی شرم کی بات تو ہمارے لیے ہے۔ تم تو ابھی بچے ہو۔ تمھیں کوئی دیکھ کر یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ بچہ آیا ہے عیاشی کو۔

مرزا۔ پھر بھی کوئی مقدس جگہ تو ہے نہیں۔

اعظم۔ میں نے کان کھول دیے ہیں استاد کے کہ ہم آئیں گے تو ضرور۔ لیکن وہاں میدان صاف ہونا چاہیے۔ ہمارے سوا اور کوئی نہ ہو گا۔

مرزا۔ یہ انتظام تو ضروری ہے بے شک۔

اعظم۔ اور وہ نئی غزل کون سی کہی ہے پہلے ہمیں تو سنا دیں۔

مرزا۔ وہیں سُن لیجیے گا۔

اعظم۔ اَدِ پہ ٹہلتے ہوئے ادھر چلیں۔

پانچواں منظر۔ کوٹھا

نائکہ۔ اے میں نے کہا خاں صاحب! ابھی تک تو وہ آئے نہیں۔ آخر انھوں نے کہا کیا تھا۔

استاد ۔ مغرب بعد آنے کو کہا تھا ۔ ابھی بچپن جو ٹھہرا ۔ ذرا شرماتے ہیں ۔ اس لیے ذرا اندھیرے کا انتظار کیا ہوگا۔
لڑکی (کاٹتی) میرے خیال میں تو انھوں نے یوں ہی ٹال دیا امی جان ۔
نائکہ ۔ اے تو آخر تمھیں ایسی کیا للک ہے ایک بچکانہ شاعر کے لیے ۔ اور بھئی سنو ۔ مجھے تو یقین نہیں اتنی سی عمر کا بچہ اور شعر کہے اور وہ بھی ایسے زوردار ۔ عقل سے کام لو ۔ ایک سے ایک اچھا شاعر پڑا ہوا ہے ۔ نہیں آتے نہ آئیں ۔
لڑکی ۔ واہ امی جان ۔ آپ بھی کمال کرتی ہیں ۔ ان کی عمر کم ہے تو کیا ہوا ۔ کلام میں کس قدر پختگی ہے ۔ رہا یہ کہ وہ ایسے اچھے شعر نہیں کہہ سکتے تو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ کوئی شعر انھیں سنا کر اس پر ان سے فوراً کہلوایئے سب پتہ چل جائے گا ۔ یہ تو مالک کی دین ہے امی جان ۔ اس روز کیسا رنگ جمایا ان کی غزل نے ۔
نائکہ ۔ خیر ۔ ہمارا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی بھی ہو چار پیسے کی آمد کی صورت تو ہو اس سے ۔ اگر ذرا سمجھ سے کام لو اور لڑکے کو پرچالو تو ظاہر ہے کہ اچھے گھرانے کا ہے ۔ کچھ نہ کچھ لاتا ہی رہے گا ۔
لڑکی ۔ گھر سے چوری کر کے یہ مطلب ہے آپ کا ۔
نائکہ ۔ ہمیں تو اپنے کام سے کام ، کہیں سے اور کیسے بھی لائے ۔
لڑکی ۔ جی نہیں معاف کیجیے ۔ اسی وجہ سے تو ہم لوگ بدنام ہیں ۔ اے لو ۔ شاید وہ آگئے ۔
استاد ۔ وہی ہیں ۔ آیئے آیئے سرکار ۔ بڑی راہ دکھائی ۔
نائکہ ۔ تسلیم ۔ اللہ اللہ ۔ آپ تو عید کا چاند ہو گئے ۔ نوشہ میاں تشریف رکھیں ۔
اعظم ۔ بہت خوب ۔ کہیے آپ کا مزاج کیسا ہے ۔
نائکہ ۔ ہم غریبوں کا کیا مزاج حضور ۔ ذرا آرام سے کھل کر بیٹھیے ۔ یہ نئی دلہنوں کی طرح آپ اتنے شرماتے کیوں ہیں ۔
اعظم ۔ وہ بات یہ ہے کہ ایسی جگہ حاضری سے ذرا جھجکتے ہیں ہمارے مرزا نوشہ ۔
نائکہ ۔ سبحان اللہ یہ جھجک بھی اچھی ہوئی ۔ دنیا دیوانی ہو تو ہو ۔ مگر اندھی نہیں بن سکتی ۔ کوئی کیا ان کے متعلق یہ گمان کر سکتا ہے کہ یہ بھی آئے ہوں گے یہاں کسی للک میں ۔ لاکھ سمجھدار سہی پھر بھی ابھی بچوں میں شمار ہے ان کا ۔
اعظم ۔ پھر بھی خاندانی وقار اور بزرگوں کے نام کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے ۔
نائکہ ۔ یہ بھی غلط ۔ یوں فرمائیں کہ زمانہ خراب آن لگا ہے ورنہ یہ کوٹھے تو وہ ہیں جہاں رئیس زادے تہذیب و تمیز کی تربیت کے لیے حاضری دیا کرتے تھے کسی زمانے میں ۔

اعظم ۔ بے شک ۔ مگر وہ زمانہ وہ تھا جبکہ آپ لوگوں کا پیشہ صرف فن کی خدمت تک محدود ہوتا تھا۔
نائکہ ۔ یہ بھی درست ہے ۔
مرزا ۔ ہاں تو فرمائیں کیا حکم ہے ۔ ہمیں ذرا جلدی واپس ہونا ہے ۔
نائکہ ۔ جی بندی نے تو کوئی حکم نامہ جاری کیا نہیں ۔ یہ رہیں آپ کی پرستار ۔ نہیں بلکہ آپ کے کلام کی شیدائی ۔ کامنی بائی ۔ یہ کوئی نئی غزل چاہتی ہیں آپ سے ۔
استاد ۔ ابھی وہ تو سرکار لائے ہی ہوں گے ۔ مگر ان کو وہ اس دن والی ان کی غزل تو سنا دی جائے جو پہلے عنایت ہوئی تھی ۔
اعظم ۔ ہاں یہ زیادہ مناسب ہوگا ۔
مرزا ۔ اب اس کا کیا سننا چلیے بھی ۔
اعظم ۔ نہیں سن کر چلیں گے ۔
استاد ۔ تو پھر بسم اللہ ۔ آرام سے تشریف رکھیں اور ملاحظہ فرمائیں کہ کامنی بائی نے حضور کے کلام کو کیا چار چاند لگائے ہیں ۔ ہاں بٹیا ہو جاؤ شروع ۔

غزل

کامنی (لڑکی) ہر گھڑی ان کا تصور آن کر تڑپائے ہے
بیکلی سی بیکلی ہے دل کہاں کل پائے ہے
دلبری کی ہے ادا ۔ دل چھین کر اترائے ہے
حسرتِ دیدار پہ وہ اور بھی ترسائے ہے
ویسے تو معصوم صورت پر ہے فطرت میں غضب
سعی لا حاصل ۔ کہیں باتوں میں ظالم آئے ہے
ساتھ لاتا ہے رقیبوں کو عیادت کے لیے
یہ قیامت دیکھیے طرفہ ستم کیا ڈھائے ہے
دل ہی جب غارت ہوا تو پھر کہاں احساس غم
اب تو آنکھوں میں ہیں آنسو اور نہ لب پر ہائے ہے
اپنی پاکیزہ محبت کا تقاضا پاک ہے
اس سے کیا لینا جو پہلو غیر کا گرمائے ہے
روک دوں فریاد اپنی یا کروں اظہارِ غم
اے دلِ رم خوردہ کہہ اس میں تری کیا رائے ہے
بے خبر محفل میں ان کی ہے رقیبوں کا ہجوم
میں بھی کچھ سادہ نہیں ایسے میں کیوں بلوائے ہے
تشنگی پھر بڑھ چلی خار مغیلاں کی اسد
یاد صحرا نے کیا تلوا ہرا کھجلائے ہے

(پردہ گرتا ہے)

آل احمد سرور

نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب

ہر کفِ خاک جگر تشنۂ صد رنگ ظہور
موجِ خمیازۂ یک نشہ، چہ اسلام و چہ کفر

وحشتِ دل سے پریشاں ہیں، چراغانِ خیال
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب

خشتِ پشتِ دستِ عجز و قالب آغوشِ وداع
تو یک جہاں قماشِ ہوس جمع کر کہ میں

خورِ شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسد
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

خاکبازیِ امید، کارخانۂ طفلی
شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اس کا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے، ہر ذرۂ خاک
وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے

ناتوانی ہے تماشائی عمرِ رفتہ
بے خبر مت کہہ ہمیں، بیدرد، خود بینی سے پوچھ

اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بے تابی
اسد یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسد

غنچے کے میکدے میں مستِ تامل ہے بہار
کجیِ یک خطِ مسطر، چہ توہم چہ یقیں

باندھیں ہوں آئینے پر چشمِ پریکی سے آئیں
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

پُر ہوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا
حیرت مطاعِ عالمِ نقصان و سود تھا

سر تا قدم گذارشِ ذوقِ سجود تھا
ہم نے، دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا
صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا
مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

رنگ نے آئینہ آنکھوں کے مقابل باندھا
قلزمِ ذوقِ نظر میں آئینہ پایاب تھا

نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا
جسے تو بندگی کہتا ہے دعوٰے ہے خدائی کا

شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا
اگرچہ گم شدہ ہے کار و بارِ دنیا کا

شررِ فرصت نگہ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے
سراپا یک آئینہ دارِ شکستن
بصورتِ تکلف، بمعنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا
اے وائے غفلتِ نگہِ شوق! ورنہ یاں
شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
ہر رنگ میں جلا اسدِؔ فتنہ انتظار
خود پرستی سے رہے باہمد گر نا آشنا
بے دماغی شکوہ سنجِ رشک ہم دیگر نہیں
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
گر شہادت آرزو ہے نشے میں گستاخ ہو
خانمانِ عاشقاں دوکانِ آتش باز ہے.
اے آہ میری خاطرِ وابستہ کے سوا
بہوس، دردِ سر اہلِ سلامت تاچند
طبع کی واشد نے رنگِ یک گلستاں گل کیا
رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اسدؔ خاکِ درِ مے خانہ اب سر پہ اٹھاتا ہوں
بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں
اسدؔ تارِ نفس ہے ناگزیرِ عقدہ پیرائی
فنا کو عشق ہے بے مقصداں حیرت پرستاراں
لڑا دے گر وہ بزمِ میکشی میں قہر و شفقت کو
اسدؔ سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
بہ تمنا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار
عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
شوق سامانِ فضولی ہے، وگرنہ غالبؔ
شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا

بقدرِ رنگ یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا
ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا
ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا
پیمانۂ برات ماہ کا لبریزِ نور تھا
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا
تار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
بال شیشے کا، رگِ سنگِ فساں ہو جائے گا
شعلہ رو جب ہو گئے گرمِ تماشا، جل گیا
دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا
مشکل عشق ہوں مطلب نہیں آساں میرا
یہ دلِ وابستہ گویا بیضۂ طاؤس تھا
اشارت فہم کو ہر ناحق بریدہ، ابرو تھا
گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے سے زانو زانو تھا
خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا
بنوکِ ناحقِ شمشیر کیجے حل مشکلہا
نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا
بھرے پیمانۂ صد زندگانی ایک جام اس کا
کہ کشتِ خشک اس کا، ابرِ بے پروا خرام اس کا
دیدہ گو خوں ہو تماشائے چمن مطلب تھا
ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا
ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

نہ بخشی فرصتِ یک شبنمستاں جلوۂ خور نے
دیوانگی اسد کی حسرت کش طرب ہے
ہوا نے ابر سے کی موسمِ گل میں نمد بافی
ہے گرفتاری نیرنگ تماشا ہستی
دیدِ حیرت کش و خورشید چراغانِ خیال
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
اسد اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسد
عروجِ نا امیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے
بسنگِ شیشہ توڑوں ساقیا پیمانۂ پیماں
اسد مایوس مت ہو، اگرچہ رونے میں اثر کم ہے
تیرگیِ ظاہری ہے طبعِ آگہ کا نشاں
عمر میری ہو گئی صرفِ بہارِ حسنِ یار
جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھے ہے، ادھر، انگشت
اے عدوئے مصلحت چندے بضبط افسردہ رہ
دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ
وفورِ وفا ہے، ہجومِ بلا ہے
جبکہ نقشِ مدعا ہووے نہ جز موجِ سراب
نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں
بزمِ نظر میں بیضۂ طاؤس خلوتاں
کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا
جوابِ سنگدلی ہائے دشمناں ہمت
ہلاکِ بے خبری نغمۂ وجود و عدم
قاتل بعزمِ ناز و دل از زخم وا گداز
اے چرخ خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات

تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا
در سر ہوائے گلشن، دل میں غبارِ صحرا
کہ تھا آئینۂ خور پہ تصورِ رنگ بستن کا
پرِ طاؤس سے دل پائے بزنجیر آیا
عرضِ شبنم سے چمن آئینہ تعمیر آیا
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاقِ تحسیں کا
نقص پہ اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا
بہارِ بے خزاں از آہِ بے تاثیر ہے پیدا
اگر ابرِ سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا
کہ غالب ہے کہ بعد از زاریِ بسیار ہو پیدا
غافلاں عکسِ سوادِ صفحہ ہے، گردِ کتاب
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب
بیکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے، مگر انگشت
گردنی ہے جمع تابِ شوخیِ دیدارِ دوست
دل ددستِ اربابِ ہمت سلامت
سلامت ملامت، ملامت سلامت
وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث
اگر یہی عرقِ فتنہ ہے مکرر کھینچ
فرشِ طرب بہ گلشنِ نا آفریدہ کھینچ
سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ
ز دستِ شیشۂ دلہائے دوستاں فریاد
جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد
شمشیر آبدار و نگاہ آبدار تر
لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے

فانوسِ شمع ہے کفن کشتگانِ شوق

فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے

اے اسدؔ ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں

کفر ہے غیرازِ وفورِ شوق رہبر ڈھونڈھنا

آشنا غالب نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا

جوں چشمِ باز ماندہ ہے ہر یک بسوئے دل

آتشِ رنگِ رُخ ہر گل کو بخشے ہے فروغ

برہم ہے بزمِ غنچہ بیک جنبشِ نشاط

یک بخت اوج، نذرِ سبکباریٔ اسدؔ

ہے سر نوشت میں رقمِ واشکستگی

اسدؔ فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا

تماشائے گلشن تمنائے چیدن

نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں

اسدؔ شکوہ کفر و دعا ناسپاسی

گل، غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے

قید میں بھی ہے اسیری آزاد

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا

تمیزِ زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں

معافِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز

برنگِ سبزہ عزیزانِ بد زباں یک دست

نے کوچۂ رسوائی و زنجیر پریشاں

ہے غیرتِ الفت کہ اسدؔ اس کی ادا پر

ظاہر ہیں مری شکل سے افسوس کے نشاں

دشمنی ہے وصال کا مذکور

دریدہ ہے معاملۂ سوختن ہنوز

نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز

کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

ظاہرا صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

راہِ صحرائے حرم میں ہے جرسِ ناقوس بس

ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ استماع

رکھتا ہے داغ تازہ کایاں انتظارِ داغ

ہے دمِ سردِ صبا سے گرمیٔ بازارِ باغ

کاشانہ بسکہ تنگ ہے غافل ہوا نہ مانگ

سر پر وبالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

ہوں جوں خطِ شکستہ بہر جا شکستہ دل

وگرنہ دلبریٔ وعدۂ وفا معلوم

بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم

نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم

اے آگہی فریبِ تماشا کہاں نہیں

چشمِ زنجیر کو وا باندھتے ہیں

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

بعکسِ آئینہ، یک فرد سادہ رکھتے ہیں

دلے بدستِ نگارے نداده رکھتے ہیں

ہزار تیغ بزہراب داده رکھتے ہیں

اے نالہ، ہیں کس پردے میں آہنگ نکالوں

گر دیدہ و دل صلح کریں جنگ نکالوں

جوں شانہ پشتِ دست بدنداں گزیدہ ہوں

میں چشمِ واکشادہ و نرگس نظر فریب
پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو
سر پہ مرے وبالِ ہزار آرزو رہا
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
نہ انشا معنیٔ مضموں نہ املا صورتِ موزوں
فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
ہے طلسمِ دہر میں، صد حشر پاداشِ عمل
ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
دل کو اظہارِ سخن، اندازِ فتح الباب ہے
رنجشِ دل یک جہاں ویراں کرے گی اے فلک
ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
زلفِ خیال نازک و اظہار بے قرار
رنگِ طرب ہے صورتِ عہدِ وفا گرو
جز دل سراغِ درد بدل خفتگاں نہ پوچھ
ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
گاہ بخلد امیدوار گہ بہ جحیم بیم ناک
شیشۂ شکستِ اعتبار، رنگ بگردش استوار
نغمہ ہے، محو ساز رہ، نشہ ہے، بے نیاز رہ
نے سرو برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو
مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
طاقت فسانۂ باد، اندیشہ شعلۂ ایجاد
ہے یاس میں اسد کو ساقی سے بھی فراغت
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ

لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں
مانندِ موجِ آب زبانِ بریدہ ہوں
یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں
عنایت نامہ ہائے اہلِ دنیا ہرزہ عنواں ہیں
برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں
آگہی غافل کہ اک امروز بے فردا نہیں
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
یاں صریرِ خامہ غیر از اصطکاکِ در نہیں
دشت ساماں ہے غبارِ خاطرِ آزردگاں
اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو
یارب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو
تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو
آئینہ عرض کر خط و خال بیاں نہ پوچھ
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ
خانۂ آگہی خراب دل نہ سمجھ، بلا سمجھ
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ
گر نہ مٹیں یہ کوہسار، آپ کو تو صدا سمجھ
رند تمام ناز رہ، خلق کو پارسا سمجھ
اے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ
کہیں ہو جائے جلد، اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی
اے غم ہنوز آتش، اے دل ہنوز خامی
دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی
لبِ قدح بہ کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
تا چند پستِ فطرتیِ طبعِ آرزو
یکبار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی
عروجِ نشہ ہے سرتا قدم قدِ چمن رویاں
ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ
اسدؔ بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اسدؔ جمعیتِ دل در کنارِ بے خودی خوشتر
ساقی، بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش
شوخیِ اظہار غیر از وحشتِ مجنوں نہیں
آتش افروزیِ یک شعلہ ایما تجھ سے
اے سرِ شوریدہ ذوقِ عشق و پاسِ آبرو
نگہ معمارِ حسرت ہا، چہ آبادی؟ چہ ویرانی؟
دل سراپا وقفِ سودائے نگاہِ تیز ہے
ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے
اسدؔ بہار تماشائے گلستانِ حیات
نقشِ عبرت در نظر ہا، نقدِ عشرت در بساط
اختلافِ رنگ و بو، طرحِ بہارِ بے خودی
تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
برنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دلِ خالی
خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
زباں سے عرضِ تمنّائے خامشی معلوم
آرزوے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر

یعنی ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے
یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے
اے جوشِ عشق، بادۂ مرد آزما مجھے
ولیکن کیا کروں آوے جو رسوائی گریباں کی
بجائے خود، وگرنہ، سرو بھی مینائے خالی ہے
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے،
اگر وا ہو تو دکھلاؤں کہ یک عالم گلستاں ہے
دو عالم آگہی، سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے
پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے
لیلیِ معنی اسدؔ محمل نشینِ راز ہے
چشمک آرائیِ صد شہر چراغاں مجھ سے
جوشِ سودا کب حریفِ منتِ دستار ہے
کہ مژگاں جس طرف وا ہو، کفِ دامانِ صحرا ہے
یہ زمیں مثلِ نیستاں، سخت ناوک خیز ہے
بے ستوں خوابِ گرانِ خسرو پرویز ہے
وصالِ لالہ عذاران سرو قامت ہے
دو جہاں وسعت، بقدرِ یک فضائے خندہ ہے
صلحِ گل، گردابِ گاہِ نزاعِ جلوہ ہے
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی
کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے
وہ جلوہ گر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
مگر وہ خانہ برانداز گفتگو جانے
کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

طلسمِ منتِ یک خلق سے رہائی دی
جہاں جہاں مرے قاتل کا مجھ پہ احساں ہے

دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں
پر فشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

جس طرف سے آئے ہیں آخر ادھر ہی جائینگے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم ہموار ہے

تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع، دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

واماندگی بہانہ و دل بستگی فریب
دردِ طلب بہ آبلۂ پا نہ کھینچیے

نہ حیرت چشمِ ساقی کی، نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں غالب گردشِ افلاک باقی ہے

لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار
ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم میں لگایا ہے مجھے

وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجز و فا
اسد ہنوز گمانِ غرورِ دانائی

ہے سادگیِ ذہن تمنائے تماشا
جائے کہ اسد رنگِ چمن یافتنی ہے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے
چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے

چمن چمن گلِ آئینہ در کنارِ ہوس
امید محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے

وہ تشنۂ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بکیفیتِ ساغر نظر آوے

یک نفس، ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں
حیف ہے ان کو جو کھوویں زندگانی مفت ہے

اسد جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو، حالِ دل پرسیدنی جانے

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

بیاضِ علائی صفحہ ۲۹۹ نسخۂ عرشی

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اول خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، و لے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے میں ہرچند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مرتبۂ ڈاکٹر محمد انصار اللہ

آب حیات میں
مرزا کے ذاتی حالات

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک تحقیقی پروگرام کے تحت شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے بے نظیر تذکرہ "آب حیات" کی تدوین کا کام شروع کیا جا چکا ہے۔ "فکر و نظر" کے اس خصوصی شمارے میں اسی تحقیقی پروگرام سے لے کر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ذاتی حالات درج کیے جا رہے ہیں۔

(ایڈیٹر)

نام اسد اللہ تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے[1]۔ جھجر میں کوئی فرومایہ[2] سا شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا ؎

اسد[3] تم نے بنائی یہ غزل خوب　　ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا کیونکہ ان کا ایک یہ بھی قاعدہ* تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک الحال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے[4]۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۸ء میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے

---

* دیوان فارسی میں بیس پچیس شعر کا ایک قطعہ لکھا ہے بعض اشخاص کا خیال ہے کہ ذوق[5] کی طرف چشمک ہے غرض کہ اس میں کا ایک شعر ہے ؎

راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید　　ہرچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است

(آزاد)

---

[1] مرزا خود لکھتے ہیں: "از روزے کہ شمارہ سنین عمر از ... یازدہ ہمیں گرہ بخود گرفت ... بادیہ سخن پیمودن آغاز نہاد" (دیوان غالب طبع اول) اس بنیاد پہ یہ خیال کیا گیا ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کا آغاز عمر کے دسویں سال سے کیا۔

[2] مصحفی لکھتے ہیں: "اسد کہ میر امانی نام دارد، جوانی بود، ظریف مزاج و خندہ روی شاگرد مرزا محمد رفیع (بقیہ صفحہ ۱۰۶ پر)

غالب تخلص[56] اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انھیں اسی طرح رہنے دیا۔

خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل ہوا تو غریب خانہ برباد جنگلوں پہاڑوں میں چلے گئے مگر جوہر کی کشش نے تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ سپہ گری ہمت کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگی۔ سینکڑوں برس کے بعد پھر اقبال ادھر جھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلجوقی خاندان کی بنیاد انھیں میں قائم ہو گئی مگر اقبال کا جھکنا جھونکا ہوا کا ہے، کئی پشتوں کے بعد اس نے پھر رخ پلٹا اور سمرقند میں جس طرح اور شرفا تھے اسی طرح سلجوقی شہزادوں کو بھی گھروں میں بٹھا دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۵) دیوانی ضخیم ترتیب دادہ، در قصائد و غزل و مثنوی ماہر، خصوصاً مثنوی گنجفہ را بسیار بہ تلاش گفتہ ... اصلش از شاہجہاں آباد است و بقولی اکبرآباد ... در اثنائے راہ در سرائے بانگر مئو ہنگام شب بر دست دزداں کشتہ شد، عمرش قریب پنجاہ خواہد بود" (عقد ثریا ص ۱۶)

یہ شخص ایسا "فرومایہ" بھی معلوم نہیں ہوتا۔ سودا کا شاگرد اور خود بھی اپنے وقت کا استاد تھا۔ مصحفی نے اس کے ایک شاگرد کا ذکر کیا ہے "مست جوان نوخواستہ بود شاگرد میر امانی اسد ..." (عقد ثریا ص ۲۲۸)

۵۳ اسد کا مقطع اس طرح ہے ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی (عقد ثریا ص ۱۶)

ممکن ہے کسی شخص نے ازراہ تمسخر یا طنز مقطع کو بدل کر مرزا کے سامنے اس طرح پڑھا ہو۔

۵۴ یہ صحیح نہیں، مرزا کا کلام غالب تخلص کے ساتھ "تذکرۂ سرور" میں درج ہے۔ تبدیلی تخلص کا صحیح سال ۱۸۲۲ء کے قریب ہوگا۔

۵۵ ذوق کے ساتھ چشمک کا اندازہ شمس العلما مولانا ذکاء اللہ کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے:-

"مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ ... حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا، سنگدل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مرگیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مرگیا۔" (بحوالہ نگار، رامپور، فروری ۱۹۶۳ء ص ۱۱)

۵۶ مرزا کے قریب العہد شعرا میں ایک سے زیادہ غالب تخلص کرتے تھے اور ان میں ہر طبقہ کے لوگ تھے مثلاً انور علی غالب ملازم نواب جھجھر (سراپا سخن ص ۲۸۸) بہادر بیگ خاں غالب ابن مکرم الدولہ نیاز بیگ خان بہادر طالب جنگ (مجموعہ نغز ص ۲۳) غالب علی خاں غالب نبیرۂ دوندی خاں (گلشن بیخار ص ۱۳۵) لالہ موہن لال غالب اکبرآبادی (یادگار شعرا ص ۱۴۷) نواب اسد اللہ خان بہادر مخاطب بہ سید الملک، امام جنگ دہلوی متخلص بہ غالب (گلزار ابراہیم ص ۱۸۱) وغیرہ

مرزا صاحب کے دادا[57] گھر چھوڑ کر نکلے۔ شاہ عالم[58] کا زمانہ تھا کہ دہلی میں آئے۔ یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے شاہی دربار میں عزت پائی اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے پہاسو کا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات اور رسالے کی تنخواہ میں لیا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگام گرم ہوا۔ وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ[59] مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز بعد حیدرآباد میں جا کر نواب نظام علی خاں[60] بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد ایک خانہ جنگی کے کھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی وہاں سے گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں[61] مارے گئے۔ اس وقت مرزا کی پانچ برس[62] کی عمر تھی۔ نصراللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صوبیدار تھے انھوں نے در یتیم کو دامن میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں[63] جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو صوبیداری کمشنری ہوگئی ان کے چچا کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور چار سو سوار کے افسر ہوئے۔ سترہ سو روپیہ مہینہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر[64] سونگ سون (کذا) کے پرگنہ پر حین حیات مقرر ہوگئی۔

مرزا چچا کے سایہ میں پرورش پاتے تھے مگر اتفاق یہ کہ مرگ ناگہانی میں[65] وہ مر گئے۔ رسالہ برطرف

---

۵۷ مرزا قوقان بیگ خاں نام تھا۔ ترک وطن کر کے لاہور پہنچے اور یہاں آکر معین الملک عرف مرزا منو کے ملازم ہوئے۔ مرزا منو کا انتقال ۱۷۵۳ء/۱۱۶۷ھ میں ہوگیا تھا اس لیے قوقان بیگ کے ورود لاہور کا زمانہ اس سے پہلے کا ہے اس وقت دہلی میں احمد شاہ بادشاہ تھے۔

۵۸ شاہ عالم کا زمانہ ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ تا ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ ہے۔

۵۹ آصف الدولہ کی نیابت کا زمانہ ۱۷۷۵ء/۱۱۸۸ھ سے ۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ تک کا ہے۔ ان کا انتقال شاہ عالم کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔

۶۰ نواب نظام علی خاں بہادر کا دور ۱۱۷۵ھ سے ۱۲۱۸ھ تک رہا۔

۶۱ مرزا عبداللہ بیگ خاں ۱۸۰۲ء میں شہید ہوئے۔

۶۲ مرزا اسداللہ خاں غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔

۶۳ خود غالب نے اپنے سلسلۂ حالات میں لکھا ہے: "۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد پر آئے تو نصراللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔" (غالب کے خود نوشت حالات از اظہار الحق ملک مشمولہ احوال غالب ص ۲۷)

۶۴ صحیح سونکھ (SONEKH) اور سونسا (SONSA) ہے۔

۶۵ نصراللہ بیگ کا انتقال ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ میں ہوا۔

ہوگیا جاگیر ضبط ہوگئی بزرگوں نے لاکھوں روپیہ کی جائداد چھوڑی تھی قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے وہ امیرزادہ جو شاہانہ دل ودماغ لے کر آیا تھا اسے ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کرکے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے مگر سب کھیل بن بن کر بگڑ گئے۔ چنانچہ اخیر میں کسی دوست نے انھیں لکھا کہ نظام دکن کے لیے قصیدہ کہہ کر فلاں ذریعہ سے بھیجیے اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں :۔

"پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض[۱۹] میرے

+ اصل حال یہ ہے کہ جب مرزا نے اپنا دعویٰ کلکتہ میں پیش کیا تو سرکار نے اس کا فیصلہ سرجان مالکم صاحب گورنر بمبئی کے سپرد کیا کیونکہ جب جاگیروں کی سندیں لکھی گئی تھیں تو وہ لارڈ لیک صاحب کمانڈر انچیف ہندوستان کے سکریٹری تھے اور انھیں کے دستخط سے اسناد جاری ہوئے تھے۔ جب ان کے پاس یہ مقدمہ اور اس کے کاغذات پہنچے تو انھوں نے کہا کہ مدعی غلط کہتا ہے۔ نواب[۱۶] احمد بخش خاں ہمارا قدیمی دوست تھا اور بڑا راستباز تھا اس پر یہ اتہام ضد سے کیا گیا ہے۔ ہم نے پانچ ہزار روپے سالانہ لکھا تھا جس میں سے تین ہزار مدعی اور اس کے متوسلین کے لیے اور دو ہزار خواجہ[۱۷] حاجی اور اس کے وارثوں کے نام تھے پھر مرزا صاحب نے ولایت میں مرافعہ کیا وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ بموجب تحقیق نواب[۱۸] ضیاء الدین خاں بہادر دام ظلہم العالی کے تحریر ہوا۔ (آزاد)

---

[۱۶] نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ، دلاور الملک، رستم جنگ کے خطابات سے سرفراز تھے نواب الٰہی بخش خاں معروف کے حقیقی بھائی تھے اور معروف مرزا کے خسر تھے۔

[۱۷] خواجہ حاجی خاں ابن خواجہ قطب الدین خاں ابن رستم خاں۔ مرزا غالب کے ددھیالی رشتے سے بھائی ہوتا تھا۔ نصر اللہ بیگ کے سواروں کا یہ شخص بھی ایک افسر تھا اور اسے بھی پنشن کے معاملے میں ان کے پسماندگان میں شمار کیا گیا تھا۔

[۱۸] نواب احمد بخش خاں کے خلف الرشید تھے۔ شعر کہتے تھے۔ نیر درخشاں تخلص کرتے تھے اور فن شعر میں مرزا کے شاگرد تھے ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء میں انتقال ہوا۔

[۱۹] حقیقت یہ ہے کہ نصر اللہ بیگ کے انتقال کے بعد سونکھ سونسا کی جاگیر پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے نواب احمد بخش خاں کے پچیس ہزار روپیہ اس شرط پر معاف کردیے کہ وہ (بقیہ ص ۱۰۹ پر)

اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے انھوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیہ سال ان میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبرک[۵۲۰] صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر ریذیڈنٹ معزول ہو گئے سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی[۵۲۱] نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا ان کے ولی عہد[۵۲۲] اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے یعنی اگرچہ جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔"

غرض کہ نواب احمد بخش خاں بہادر کی تقسیم سے مرزائے مرحوم نالاں ہو کر ۱۸۲۳ء[۵۲۳] میں کلکتہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۸) دس ہزار روپے سالانہ نصر اللہ بیگ کے پسماندوں کو دیں ... ایک مہینہ تین دن بعد یعنی ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک اور حکم حاصل کر لیا ... کہ پانچ ہزار سالانہ نصر اللہ بیگ کے پسماندوں کو دیے جائیں (غالب کی خاندانی پنشن از غلام رسول مہر مشمولہ احوال غالب ص ۱۳۲)

۵۲۰ کولبروک نے مرزا کے حق میں رپورٹ کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ بلا کا رشوت خور تھا اور مقدمہ پیش ہونے سے پہلے ہی موقوف ہو گیا اینڈریو اسٹرلنگ مرزا کے حق میں رپورٹ کرنے سے پیشتر فوت ہو گیا (ایضاً ص ۱۳۵)

۵۲۱ ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ بادشاہ نے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطابات سے نوازا اور تاریخ نویسی پر مقرر کر کے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ کی۔

۵۲۲ ولی عہد سے مراد فتح الملک مرزا فخر الدین عرف مرزا فخرو ہیں۔ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ شیخ ذوق کے شاگرد تھے۔

۵۲۳ مرزا اپریل ۱۸۲۷ء میں دہلی سے روانہ ہوئے اور فروری ۱۸۲۸ء کو بنگال میں پہنچے۔ اکتوبر ۱۸۲۹ء میں وہ کلکتہ سے رخصت ہوئے۔

گئے اور گورنر جنرل[۱۲۴] سے ملنا چاہا وہاں دفتر دیکھا گیا اس میں سے ایسا کچھ معلوم ہوا کہ اعزاز خاندانی کے ساتھ ملازمت ہو جائے اور سات پارچہ خلعت مع رقم جیغہ مرصع مالائے مروارید ریاست دودمانی رعایت سے مقرر ہوا۔

غرض مرزا کلکتہ سے ناکام پھرے اور ایامِ جوانی ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بزرگوں کا سرمایہ تمام کر کے دلی میں آئے یہاں اگرچہ گزران کا امیرانہ شان سے تھا اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی مگر اپنے علو حوصلہ اور بلند نظری کے ہاتھوں تنگ رہتے تھے پھر بھی طبیعت ایسی شگفتہ پائی تھی کہ ان دقتوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے ہمیشہ ہنس کھیل کر غم غلط کر دیتے تھے۔ کیا خوب فرمایا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

جب دلی تباہ ہوئی تو زیادہ تر مصیبت پڑی ادھر قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی ادھر پنشن بند ہو گئی اور انھیں رام پور جانا پڑا۔ نواب[۱۲۵] صاحب سے بیس پچیس برس کا تعارف تھا۔ ۱۸۵۵ء میں ان کے شاگرد ہوئے تھے اور ناظم تخلص قرار پایا تھا۔ وہ گاہے گاہے غزل بھیج دیتے تھے کبھی روپیہ بھی آتا تھا، اس وقت قلعہ کی تنخواہ جاری پنشن کھلی ہوئی تھی۔ ان کی عنایت فتوح غیبی گنی جاتی تھی، جب دلی کی صورت بگڑی تو زندگی کا مدار اس پر ہو گیا نواب صاحب نے سو روپیہ مہینہ کر دیا اور انھیں بڑی تاکید سے بلایا۔ یہ گئے تو تعظیمِ خاندانی کے ساتھ دوستانہ و شاگردانہ بغل گیر ہو کر ملاقات کی اور جب تک رکھا کمال عزت کے ساتھ رکھا بلکہ سو روپیہ مہینہ ضیافت کا زیادہ کر دیا مرزا کو دلّی کے بغیر چین کہاں؟ چند روز کے بعد رخصت ہو کر پھر وہیں چلے آئے چونکہ سرکاری پنشن بھی جاری ہو گئی تھی اس لیے چند سال زندگی بسر کی۔

آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کیا۔ کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا وہ دیکھ کر جواب دے دیتے

۱۲۴؎ ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۵ء تک ولیم بنٹنگ گورنر جنرل رہے۔

۱۲۵؎ نواب سید یوسف علی خاں ابن نواب محمد سعید خاں والی رامپور ۱۸۵۵ء/۱۲۷۱ھ میں مسند نشین ریاست ہوئے پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے۔ پھر مرزا غالب کو اپنا استاد مقرر کیا۔ ناظم تخلص کرتے تھے۔

۱۲۶؎ ۱۸۶۳ء میں حکومت انگریزی سے خلعت کا اعزاز ملا۔

تھے خوراک دو تین برس سے یہ رہ گئی تھی کہ صبح پانچ سات بادام کا شیرہ، بارہ بجے آب گوشت شام کو چار کباب تلے ہوئے۔ آخر تہتر برس کی عمر ۱۸۶۹ء/ ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال فرمایا اور بندۂ آثم نے تاریخ لکھی:۔

"آہ غالب بمرد"

مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر یہی پڑھا کرتے تھے ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

آل احمد سرور

پورے غالب

(THE WHOLE OF GHALIB)

ہماری تنقید اب تک ادب کے کسی نہ کسی پابند تصور سے آزاد نہیں ہو سکی ہے گو حال میں اس تصور سے بلندی اور ادب کی اپنی خصوصیت کو واضح کرنے کی کوششیں ملنے لگی ہیں۔ ادب میں اخلاق، ادب میں مذہبی تصورات، ادب میں تصوف، ادب میں سماجی قدریں، ادب میں انسان دوستی کے ہر نظریے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ادب کا مقصد ان میں سے کسی نقطۂ نظر کی ترجمانی یا اشاعت ہے۔ مگر ادب تلقین نہیں ہے تخلیق ہے۔ یہ SAYING نہیں ہے MAKING ہے۔ ادب کی قدر و قیمت اس بات سے متعین نہیں ہوتی کہ وہ صحیفۂ اخلاق یا سماجی دستاویز ہے۔ ادب خود اخلاق ہے اور وہ اپنے طور پر سماجی بصیرت بھی دیتا ہے۔ ادب کا کوئی تعلق نہ پروپیگنڈے سے ہے، نہ لوگوں کی ہدایت کرنے سے، نہ راہ نجات سے، نہ فوری عمل کے لیے اکسانے سے اس کا مقصد نہ علم میں اضافہ کرنا ہے، نہ معلومات دینا ہے، نہ واقعات بیان کرنا ہے۔ اس کا مقصد تخئیلی تجربے کی ترسیل ہے لیکن ترسیل کے لیے ذمہ داری صرف فن کار کی نہیں اس کے حلقے کی بھی ہے اگر آپ کا ریڈیو سیٹ ناقص ہے یا صرف ایک ہی لہر کو گرفتار کر سکتا ہے تو اس میں لہریں پھینکنے والے آلے کا کیا قصور۔ تخئیلی تجربہ جمالیاتی قدر رکھتا ہے۔ یہ خوشگوار اور دلکش ہوتا ہے اور بظاہر ناخوشگوار اور بدصورت چیزوں سے بھی خوشگواری اخذ کر سکتا ہے۔ جس طرح دیوتا زہر سے امرت نکالتے تھے۔ یہ سنسنی خیزی سے دور رہتا ہے مگر جذبے اور حواس کو اپیل کرتا ہے۔ یہ جذبے کو معروضی بناتا ہے۔ اس میں مواد فارم میں جذب ہو جاتا ہے جو دنیا نئی زبان بن جاتی ہے اور زبان میں جذبات، خیالات

اور نقطۂ نظر گھل مل کر ایک مجموعی بصیرت عطا کرتے ہیں۔ ادب کا تعلق اس سچائی سے نہیں ہے جو سائنس کی ہے، اس کا تعلق اس صداقت سے ہے جو مانی جاسکتی ہے۔ اس کا منطق سے نہیں جذبے اور اس کے جادو سے تعلق ہے۔ اسی لیے ارسطو نے ناممکن باتوں کے بیان کو جائز قرار دیا تھا مگر ناقابل قیاس باتوں کو نہیں۔ فن کی سچائی، اس کی اندرونی ضرورت اور اس کی صحت میں ہے اس کی بڑائی ہمارے جذبات کو بیدار کرنے میں ہے، اس کی معلومات کی صحت یا اس کے بیان کی علمی قیمت میں نہیں۔

فن کی سچائی تو واضح ہو گئی مگر فن کی بڑائی کس چیز میں ہے؟ ایلیٹ نے کہا تھا کہ فن کو پرکھا تو فنی معیاروں سے جائے گا، مگر اس کی بڑائی دوسرے معیاروں سے متعین ہوگی۔ بظاہر اس سے خیال ہوتا ہے کہ ایلیٹ کی مراد زندگی میں بڑائی کے معیاروں سے ہے اور غالباً یہ معیار اخلاقی یا سماجی ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان معیاروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایلیٹ یہاں زندگی کی بصیرت کی بات کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فن میں بڑائی اس نظریۂ زندگی سے آتی ہے جو قاری کو مربوط، پختہ اور حقیقی تجربہ پر مبنی معلوم ہو یعنی سوال کسی اخلاقی یا سماجی نظریے سے اتفاق کا نہیں ہے بلکہ اس کی پختگی اور گہرائی اور اس میں پوری طرح غرق ہونے کا ہے یعنی بڑی شاعری، مذہبی، سماجی متصوفانہ، اخلاقی، فلسفیانہ سبھی کچھ ہو سکتی ہے مگر اپنے من میں ڈوبنے کی وجہ سے، نہ کہ کسی بڑے فلسفے یا نظریے کی وجہ سے۔ میرے نزدیک فن کی یہ بڑائی اول تو تجربہ کی تہ داری میں ہے۔ یعنی اس تجربے کی کئی تہیں ہوں اور ان میں سے کسی تہ سے لوگ متاثر ہو سکتے ہوں یا ایک تہ کے آج روشن ہونے اور دوسری کے کل۔ دوسرے یہ بڑائی تجربے کی پیچیدگی میں ہے۔ اس سلسلے میں رچرڈس کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:۔

> "حال کے انسان کی ساری فکر اور جذبہ اس تجربے کی شکل میں ہوتا ہے جو مثال کے طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے انسان کے تجربے کے مقابلے میں زیادہ مخصوص اور منفرد ہوگا آج ہمارے درمیان ازمنۂ وسطیٰ کے انسان کا اس بڑے پیمانے پر موجود ہونا ہمارے لیے غلط فہمی کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ وہ لوگ جو سب سے زیادہ اور سب سے متنوع دلچسپیاں رکھتے ہیں، یعنی وہ لوگ جن کی زندگیاں ہمارے نظریۂ قدر کے مطابق سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہیں، وہ لوگ جن کے لیے شاعر لکھتا ہے اور جن کے لیے اپیل سے ہم اسے پرکھتے ہیں، ناگزیر طور پر اپنے ذہنوں کی تشکیل میں پہلے سے

بہت زیادہ عناصر سے کام لیتے ہیں اور شاعر جس حد تک ان مواقع سے کام لیتا ہے
جو اُسے میسر ہیں، یہی کرتا ہے۔ یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ ہم اس بنا پر اسے اپنے
قدرتی وسائل سے کام نہ لینے دیں کہ اس کے پڑھنے والے اُسے سمجھ نہیں سکیں گے
یہ اس کا قصور نہیں، یہ اس کے سماجی نظام کا قصور ہے۔"

(ادبی تنقید کے اصول ص ۱۹-۲۱۸)

یعنی غالب کے کلام کو ان کے دور میں بہت سے لوگ جب مشکل کہہ کر نظرانداز کر دیتے تھے تو اس میں قصور غالب کا کم تھا ان کے دور کا زیادہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مشاعرے کی شاعری مجموعی طور پوری اپیل کی شاعری ہے۔ دوسری بات یہ اہم ہے کہ انبوہِ سطحی کا ذہن فرد اور اس کی انفرادیت کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا۔ تیسری بات یہ بھی ہے کہ غالب نے چھبیس سال کی عمر سے پچاس سال کی عمر تک زیادہ تر فارسی میں شاعری کی اور اردو میں بہت کم کہا۔ وہ اپنے آپ کو فارسی کا شاعر سمجھتے رہے اور لوگوں کو بھی یہی باور کرا دیا۔ اسی وجہ سے گارساں دی تاسی ۱۸۴۷ء میں ذوق اور ناسخ کا ذکر کرتا ہے، غالب کا نہیں کرتا۔ اور غالب کی موت کے کافی عرصے بعد ۱۸۸۳ء میں جب سرسید کے سامنے علی گڑھ میں شعرا کے نام سے دو کمرے بنوانے کے لیے تحریک ہوتی ہے تو اردو کے شاعر ذوق اور فارسی کے شاعر غالب کا نام لیا جاتا ہے۔ ان پر اپنی اردو شاعری کی اہمیت بعد میں کھلی جس طرح اردو خطوط کی اہمیت کا راز بعد میں سمجھ میں آیا۔ ادب میں ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔ یہ حالی کا فیضان ہے کہ ان کی اردو شاعری کی اہمیت اردو دنیا پر واضح ہونی شروع ہوئی اور یہ اہمیت اور معنویت برابر بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ سرسید کی تحریک سے ادب میں مقصدیت کی لے بہت تیز ہو گئی تھی مگر مغرب کے اچھے اثرات میں سے ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ادب کی اپنی خصوصیت کو رفتہ رفتہ مناسب اہمیت ملنے لگی اور تخئیل کی پرواز، تجربے کی گہرائی، جذبے کے جادو، حسن کاری کے آداب کا احساس بڑھنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے ابتدائی کلام پر بھی نظریں پڑنے لگیں اور بجنوری نے غالب کو ایک آفاقی پس منظر میں پیش کر کے اور ان کی شاعری کی گہری معنویت کی طرف اشارہ کر کے اس رجحان کو تقویت دی۔ حالی کے اثر سے بیدل کے رنگ کو غالب کی "بے راہ روی" سمجھا گیا گو اس کی غیر معمولی بلند پروازی کو بھی تسلیم کیا گیا مگر عام معیار یہی رہا کہ شعر وہی ہے جو اِدھر قائل کے منھ سے نکلے اُدھر سامع کے دل میں اتر جائے۔ بقول حالی "جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور

بات چیت میں برتتے جاتے تھے انھیں کو جب اہل زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو ان کو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ عام فہم زبان، مانوس خیالات فوری ترسیل اور مقصدی لے کے زیر اثر غالب کی ابتدائی شاعری پر وہ توجہ نہ ہوئی جو ہونی چاہیے تھی اس میں ان شارحین کا بھی قصور رہے جنھوں نے غالب کے اشعار کے صرف معنی بیان کرنے پر قناعت کی اور نہ صوتی آہنگ کو واضح کیا، نہ الفاظ کے مناسب انتخاب اور لفظ کی نبض شناسی پر، نہ چراغان خیال پر، نہ اس کی رنگا رنگ بزم آرائی پر اور نہ ان اقدار پر جو غالب کے ان اشعار میں جلوہ گر ہیں حد یہ ہے کہ غالب کو تشبیہات اور استعارات کا بادشاہ کہتے ہوئے ان کے استعارے کے تخلیقی استعمال پر اور استعارے کے ذریعے سے معنی کے کئی پہلوؤں کی طرف ذہن کو مائل کرنے کی صلاحیت پر بھی پوری توجہ نہیں ہوئی۔ مگر غالب کا عرفان بڑھتا گیا۔ اقبال کے اشارے نے بیدل اور غالب کے رشتے پر نئے سرے سے غور کرنے کی طرف مائل کیا۔ جب عام استعمال کی زبان اور ادبی زبان کا فرق سمجھ میں آنے لگا تو محض سادگی اور فوری ترسیل قدر مطلق نہ رہیں۔ جب ادب پر نظریے کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور نظر کی گہرائی اور بلندی کو بھی قابل اعتنا سمجھا جانے لگا تو غالب کی ہمہ گیر، متنوع، زندگی کے عجائبات، تناقضات اور تضاد کی آئینہ دار شاعری کی معنویت بھی کھلی۔
جب محض خیال یا محض زبان کی میکانکی تقسیم کی لکیر کے فقیر کم ہونے لگے اور شاعری میں خیال کے انوکھے پن، اس کی معنویت، اس کی پہلو داری، اس کی پیچیدگی، جذبات کے تناؤ اور اس تناؤ کو ایک نظر یا ایک تاثر کے ذریعے سے جذب کرنے کی صلاحیت کا اعتراف ہونے لگا تو غالب کے پورے قد کا عرفان بھی بڑھا۔ چنانچہ اول تو آج ہم غالب کے دو یا تین ٹکڑے نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں غالب کی ساری شاعری کو نظر میں رکھنا ہوگا۔ دوسرے ہم اس کی ابتدائی شاعری کے عرفان کو غالب کے عرفان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، تیسرے ہم اس میں زیادہ تر خذف ریزے اور چند جواہرات نہیں دیکھتے بلکہ چند خذف ریزے اور زیادہ تر جواہرات دیکھتے ہیں اور حالی جہاں لطف کی کمی پاتے تھے وہاں گنجینۂ معنی کا ایک طلسم دریافت کر سکتے ہیں جو فتح ہو جاتا ہے تو روح کو ایک بالیدگی اور ذہن کو ایک شادابی بخشتا ہے۔
نسخۂ حمیدیہ میں غالب کے اہم اور قابل قدر اشعار تین سو سے زیادہ ہیں اور حسب ذیل مطلعوں یا پہلے شعر والی غزلیں خاص توجہ چاہتی ہیں:۔

تشنگی رفیق رہ تھی عدم یا وجود تھا   میرا سفر بطالع چشم حسود تھا

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
شگفتن کمیں گاہِ تقریب جوئی
ضعف جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا
خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
بت پرستی ہے بہارِ نقش بندی ہائے دہر
یاد روزے کہ نفس سلسلۂ یارب تھا
رات دل گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا
دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ
بیدل نہ نازِ وحشتِ جیبِ دریدہ کھینچ
قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ
بکامِ دل کریں کس طرح گمرہاں فریاد
تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند
بینش بسعیِ ضبطِ جنوں نو بہار تر
فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ
ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل
از آنجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم
جائے کہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں
جوں مردمکِ چشم سے ہوں جمع نگاہیں
تن بہ بندِ ہوس در ندادہ رکھتے ہیں
سودائے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں
فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا
تصور ہوں بے موجب آزردگاں کا
اب گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا
ہر صریرِ خامہ میں یک نالۂ ناقوس تھا
نالۂ دل بکمرِ دامنِ قطعِ شب تھا
رنگِ روئے شمع برقِ خرمنِ پروانہ تھا
دلِ دوستِ اربابِ ہمت سلامت
جوں بوئے غنچہ یک نفسِ آرمیدہ کھینچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
ہوئی ہے لغزشِ پا لکنتِ زبانِ فریاد
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند
دلِ در گدازِ نالہ نگاہ آبیار تر
نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز
جوں زلفِ یار ہوں میں سراپا شکستہ دل
رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم
دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں
خوابیدہ بحسرت کدۂ داغ ہیں آہیں
دلِ زکارِ جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں
شامِ خیالِ زلف سے صبحِ دمیدہ ہوں
برنگِ جادہ، سرِ کوئے یار رکھتے ہیں
خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں وہ گلدام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

نسخۂ حمیدیہ کے اشعار پر غور کرنے سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے یہاں غالبؔ کے بہت سے بعد کے اشعار اور تراکیب کا نقش اول نظر آتا ہے۔ یعنی غالب کا تخیل نسخۂ حمیدیہ کی تکمیل تک صورت گر اور خلاق ہو گیا تھا گو خیال کی پری ابھی آرائش جمال سے فارغ نہیں ہوئی تھی۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:-

ہر کفِ خاک جگر تشنۂ صد رنگ ظہور
غنچے کے میکدے میں مست تامل ہے بہار

موج خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام و چہ کفر
کجی یک خطِ مسطر، چہ توہم چہ یقیں

نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیر، نہ نگاہ
گردِ جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں

شورِ رسوائیٔ دل دیکھ کہ یک نالۂ شوق
لاکھ پردے میں چھپا پر وہی عریاں نکلا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسدؔ
اگرچہ گم شدہ ہے کاروبارِ دنیا کا

ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی اے بے کسی
دل ز اندازِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

نہ بخشی فرصتِ یک شبنمستاں جلوہ خور نے
تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

اسدؔ اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاقِ تحسیں کا

اے عدوئے مصلحت چندے بضبط افسردہ رہ
کردنی ہے جمع تابِ شوخیٔ دیدارِ دوست

جنبشِ دل سے ہوئے ہیں عقدہ ہائے کار وا
کمتریں مزدورِ سنگیں دست ہے فرہاد یاں

تکلف برطرف فرہاد اور اتنی سبکدستی
خیال آساں تھا لیکن خوابِ خسرو نے گرانی کی

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے
بے ستوں خوابِ گرانِ خسرو پرویز ہے

شورِ تمثال ہے کس رشکِ چمن کا یارب
آئینہ بیضۂ بلبل نظر آتا ہے مجھے

چنانچہ غالبؔ کے فکر و فن دونوں کی روح تک پہنچنے کے لیے نسخۂ حمیدیہ کا مطالعہ بہت اہم ہے۔ غالبؔ کی اس دور کی شاعری میں یہ بات خاص طور سے توجہ کے لائق ہے کہ اس عمر میں جب غالبؔ خود اپنے بیان کے مطابق "فرّ و فرہنگ سے بیگانہ" اور "نام و ننگ کے دشمن" تھے، ان کے یہاں آرائش خم کاکل سے زیادہ اندیشہ ہائے دور و دراز اور جسم کی پکار سے زیادہ روح کی پیاس حسن کی سحر انگیزی سے زیادہ عشق کی دیدہ وری ملتی ہے۔ یعنی میرؔ، نظیرؔ، جرأتؔ، مومنؔ کا سا عشق

نہیں ہے اور نہ لکھنؤ اسکول کی وہ نام نہاد خارجیت جسے کنگھی چوٹی کی شاعری کہا گیا ہے۔ اس کی
ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب کے یہاں فن کار کا ذوقِ تماشا ہے، عاشق کا ذوقِ شہادت
نہیں، دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عنفوانِ شباب میں ہی غالب کا ذہن انھیں تخئیل کے
عشرتستان کی طرف لے گیا۔ وہ دنیا کی رنگینیوں سے گزرے مگر ان رنگینیوں میں غرق نہ ہو سکے تیسری
وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ غالب کی شخصیت اپنا ایک مزاج بنانے میں جلد کامیاب ہوگئی۔ ان کے بچپن
اور عنفوانِ شباب پر ابھی بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس
سرشاری کے دور میں چند محرومیاں بھی تھیں اور یہ محرومیاں خیالی دنیا میں اپنی تلافی ڈھونڈتی
تھیں۔ کچھ رسوائیاں بھی ہیں جن کی طرف ایک مشہور غزل اور بعض خطوط میں اشارے ہیں مگر مجموعی طور
پہ غالب میر کے سے عاشق نہیں، نہ جرأت کی طرح لذتیت کے شکار ہیں، نہ نظیر کے چٹخارے
کے، نہ مومن کے عشقِ تباں کے۔ بلکہ عشق بھی ان کے یہاں وہ تیز رو ہے جس کے ساتھ وہ تھوڑی
دیر تک چلتے ہیں "تا آنکہ وہ اپنے راہبر کو پہچان لیتے ہیں جو زندگی کا عرفان عطا کرتا ہے، جو تجربے سے
تجزیے اور تجزیے سے تنظیمِ شعر کی طرف جاتا ہے۔ فن بہرحال زندگی کی ایک معنی خیز اور نئی تنظیم ہے
جو اپنی ایک جذباتی اور ذہنی زندگی رکھتا ہے۔ غالب کی معنویت اس نئی تنظیم میں ہے جو زندگی
سے عشق بھی عطا کرتی ہے اور اس کا عرفان بھی۔ یہاں تشکیک ایک نئے ایمان کی تلاش، عقلیت
گوشت میں ہڈی دریافت کرنے کی کوشش اور نفسیاتی ژرف بینی، مختلف حقائق کو الٹ پلٹ کر
ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کا دوسرا نام بن جاتی ہے۔ رومانیت ایک بت ہزار شیوہ ہے۔
غالب کی رومانیت ان کی تخئیل پرستی میں ہے۔ آگے چل کر تخئیل کی یہ پرواز تجربے کے دوش بدوش
چلتی ہے، صرف ذوقِ پرواز کے سہارے نہیں۔

میرے نزدیک غالب کے تخئیل ہی میں ان کی شوخی کا راز مضمر ہے۔ اس تخئیل نے شروع میں
ایک خیالی دنیا بنائی جس میں زندگی کی بے ربطی، منتشر جلوے، مختلف رنگ، ہونی ان ہونی، سب
ایک سنہرا ہالہ لیے اور ایک نئی رنگین اور طلسمی فضا کی حامل نظر آتی تھیں۔ اس دنیا میں شاعر آزاد تھا،
اپنی مرضی کا مالک تھا۔ خورشید و ماہ، حیات و کائنات، ہستی و عدم سب پہ حکمراں تھا، یہاں
آرزوئیں تقدیر تھیں، امیدیں حقیقت۔ یہ تخئیلی دنیا شاعر کو اس لیے عزیز تھی کہ وہ اس کے سہارے
اپنی محرومیوں کی تلافی بھی کر لیتا تھا اور اپنی شخصیت کی حفاظت بھی مگر غالب کے یہاں زندگی کے تجربے
بھی تھے، رگوں میں خون بھی دوڑتا تھا، عیشِ امروز کی روایت بھی بزرگوں سے ملی تھی اگرچہ بزرگوں کا

نیزہ قلم بن گیا تھا مگر حالات سے جنگ اور ایک وضع کی پاسداری بھی مزاج کا جزو تھی۔ اس لیے خیال کی دنیا میں رفتہ رفتہ تجربات کے رنگ گہرے ہوتے گئے۔ ہر قطرے میں دجلہ اور ہر ذرے میں صحرا دکھائی دینے لگا۔ مخصوص تجربے میں گہرائی آنے لگی اور وہ ایک آفاقیت کا حامل ہونے لگا۔ رومانیت اور طنز میں ایک رشتہ تخئیل کا ہے اگرچہ دونوں کے دائرے جدا جدا ہیں۔ ایک میں قطرہ دریا دکھائی دیتا ہے دوسرے میں دریا قطرہ۔ ایک دوربین ہے دوسرا خوردبین۔ غالب کی فکر جب پختہ ہوئی تو ان کی معنی آفرینی شوخی بن گئی۔ یہ شوخی ذہن کی براقی اور نکتہ سنجی کی ہے محض تفریحی نہیں اس کے پیچھے وہی غائر نظر ہے جو پہلے معنی کی رسی بٹنے میں صرف ہوتی تھی اور اب ہر چاند کا دھبہ اور ہر دھبے کا چاند دیکھ سکتی ہے اور جو رفتہ رفتہ ایک لطیف مزاح بن کر اپنے اوپر بھی ہنس سکتی ہے۔ غالب کبھی جذباتی نہیں ہوئے۔ جذبے سے انھوں نے آنچ لے لی مگر اسی آنچ سے آرزوؤں کے عمدے میں مزاح کا اجالا بھی کیا ان کے یہاں وہ ذہن ہے جو واقعات وحادثات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر ان کے یہاں مختلف قسم کے تجربات بھی ہیں۔ پھر ایک خاص دھن بھی، خواہ پنشن کی سہی جو انھیں کلکتے تک لے جاتی ہے۔ ان کا سابقہ بھی ہر قسم کے لوگوں سے پڑتا ہے۔ رئیس زادوں سے، عالموں سے، رندوں سے، سپاہیوں سے، صوفیوں سے۔ ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں سے، غیر ملک سے آنے والے افسروں سے۔ ان سے پہلے کسی شاعر کا حلقہ اتنا وسیع نہیں ہے، نہ اتنے لوگوں سے گہرے روابط ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ رلکے نے کہا ہے "وہ باہر دیکھتے ہیں اور ان کے اندر درخت نشو و نما پاتا ہے" یعنی معاملہ صرف خارجی حقائق کا نہیں، خارجی حقائق کے ایک شخصیت سے باطنی رابطے کا ہے SUBJECTIVE COMMUNION WITH OBJECTIVE REALITY غالب نے یہی بات ایک مزے کے شعر میں کہی ہے:۔

بے چشم دل نہ کر ہوس سیر لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے

غالب کی عظمت اس بات میں ہے کہ ان کے پاس دل کی آنکھ بھی ہے اور سیر لالہ زار بھی۔ بلکہ دل کی آنکھ نے لالہ زار کو ایک خاص رنگ عطا کیا ہے۔ غالب سے پہلے کسی شاعر کے یہاں ایسی بھرپور شخصیت نہیں ملتی۔ اس بھرپور شخصیت کا لازمی حصہ تنہائی ہے اور غالب کی یہ تنہائی مردم بیزاری کی وجہ سے نہیں، آدمیوں میں رہتے ہوئے، اپنے ایک الگ وجود اور الگ دنیا پر اصرار کی وجہ سے ہے۔ اس تنہائی نے ان کو ہر موج کے ساتھ بہنے نہ دیا، نہ ہجوم میں کھونے دیا۔ اس نے ان کے نفس کی حفاظت کی، ان کے ذہن کو تروتازہ رکھا، حادثوں کے بوجھ میں دبنے نہ دیا۔ سرخوشی میں بدمست نہ ہونے

دیا۔ اس نے انھیں پابندی (DEPENDENCE) کے بجائے آزاد روی (INDEPENDENCE) سکھائی۔ اس نے ان کی انفرادیت کو چمکایا اور اس انفرادیت کو آفاقیت کی ایک گونج بنا دیا۔ اس نے انھیں ایک جدلیاتی نظر عطا کی اور انداز استغنائے حسن کی رسوائی اور طرب گاہ رقیب کی گرسنہ مزدوری، لاف دانش و نفع عبادت، سبحہ و زنار کے پھندے کی گیرائی، ترک رسوم میں اجزائے ایماں اور سر شخص کا ورق ناخواندہ ہونا، عیاں کیا۔ اس نے زندگی کو بدلنے کے بجائے اسے دیکھنے، اُسے سمجھنے اور اس کے بکھرے ہوئے اشاروں سے اپنی داستان طلسم ہوشربا تیار کرنے کی طرف مائل کیا۔ اس نے انھیں شاعری کو پیمبری کا جزو سمجھنے کے بجائے اس کی اپنی پیمبری پر اصرار کرنا سکھایا۔

غالب وجدان کے نہیں ذہن کے شاعر ہیں۔ INSPIRATION کے نہیں INTELLECT کے۔ مگر ان کا ذہن وجدان کی پسی ہوئی بجلیوں سے بنا ہے۔ غالب دور کے نہیں دوران کے شاعر ہیں۔ ان کا وقت کا تصور ان کے زمانے کے عام معیار میں مقید نہیں۔ اس میں ماضی کا رچا ہوا شعور اور حال کے پیچ و خم کا احساس اور آنے والے دور کی کرنیں سبھی ہیں۔ خلوت دل نے ان کی شخصیت کی تربیت و تہذیب کی۔ زندگی کے تجربات نے اس شخصیت کو استواری عطا کی۔ انھوں نے آدمیت کو کافی سمجھا اور یہ اشارہ کر دیا کہ آدمی کو بھی انسان ہونا میسر نہیں۔ یہ انسانیت کے تصور سے انکار نہیں ہے مگر آدمی کی لمبی کہانی کا احساس اور اس کے وجود کا کھلے دل سے اعتراف کرنا ہے۔ جو ہے اُسے تسلیم کرنا ہے جو ہونا چاہیے اسے دوسروں کے لیے چھوڑ دینا ہے۔ غالب کی اس آدمیت سے ان کی انسان دوستی، ان کی ارضیت، ان کی رواداری، ان کی وسیع المشربی، سبھی کا سراغ ملتا ہے۔

غرض جب تک ہم سارے غالب کا مطالعہ نہ کریں، ہم غالب کی عظمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں ان کے فکر و فن کے علحدہ علحدہ خانے بھی نہیں بنانے چاہئیں ورنہ ہم اسی غلطی کا شکار ہو جائیں گے جو ہمارے بہت سے ناقدین، غالب کے خیال اور ذوق کی زبان کی تعریف کر کے کرتے تھے۔ غالب کی شخصیت اور ذوق کی شخصیت میں فرق تھا۔ ذوق کا ذہن تقلیدی تھا غالب کا باغیانہ اور کافرانہ جب کچھ منجمد حقائق جھوٹ بن جاتے ہیں تو سچ جنون کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اسی کو رسل نے کذب کی ہوشمندی کہا ہے (TO BE SANE WITH LIES) اور اس کے مقابلے میں سچ کی دیوانگی پر زور دیا ہے۔

تھی نظر میری نہاں خانۂ دل کی نقاب   بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

غالب کوئی بہت اچھے آدمی نہیں تھے مگر وہ بڑے مزے کے آدمی تھے۔ بڑے کڑھے ہوئے

آدمی تھے۔ وہ اپنے کاندھے پر اپنے بہت سے ارمانوں کی لاشیں لیے رہے مگر اس عالم میں بھی اُن کا تبسم زیرلب نہ گیا۔ ان کی نسخۂ حمیدیہ کی شاعری نے ہماری شاعری کو فکری اظہار پر قادر بنا دیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ فکری اظہار کے لیے عجمی لے ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اردو زبان ہندوستان کے ذہن، عرب کے سوز دروں، عجم کے حسن طبیعت، سب سے بقدر ضرورت اور حسب توفیق کام لے سکتی ہے۔ اب یہ خیال ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ غالبؔ کے یہاں اردو پن نہیں ہے۔ ہاں غالبؔ کے اردو پن اور آرزو کے اُردو پن میں فرق ہے۔ آرزو کا اردو پن جذبے کا ساتھ دے سکتا ہے، غالبؔ کا اُردو پن انفس و آفاق کے آیات تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے خواہ وہ ابوالکلام آزاد کی جزالت ہو یا اقبال کی حکمت، راشد کی فن کاری ہو یا عبدالعزیز خالد کی لفظ تراشی، یہ سب اردو پن کے ہی مختلف روپ ہیں۔ بڑی شاعری ایک طور پر متصوفانہ بصیرت (MYSTIC VISION) تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ ہر شاعر ایک ABSOLUTE کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ غالبؔ کے یہاں بھی یہ ABSOLUTE CONCRETES کی کثرت کے مشاہدے سے ہی سمجھ میں آتا ہے۔ اس بات کو الف۔ آر۔ لیوس نے اس طرح کہا ہے کہ آفاقیت یا عمومیت اختصاص کے سلسلے میں آتی ہے۔ زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا بیڑا اقبال نے اٹھایا مگر غالبؔ نے یہ دردِ سر مول نہ لیا انھیں سیر کے لیے برابر اور فضا درکار رہی اور وہ اس کے نظارے میں محو رہے۔ یہی ان کی عظمت کا راز ہے:۔

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اقبال نے بالِ جبریل کے ایک شعر میں کہا ہے:۔

نہ ہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

یہ خیال غالبؔ سے لیا گیا ہے اور میں یہ غالبؔ کا کارنامہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے انفرادیت کی تکمیل اور فن کے ریاض کو ایک قدر اعلیٰ کی حیثیت سے پیش کیا:۔

یک بخت اوج نذر سبکباری اسد
سر پر وبالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

(بقیہ اداریہ صفحہ ۱۰ سے آگے)

کتاب جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اندر جیت لال کی غالب کی مختصر سوانح عمری اور مالک رام کی مرزا غالب جو نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی ہے قابل ذکر ہیں۔ رسالوں نے بہت سے خاص نمبر نکالے ہیں۔ ہندستان سے فروغ اردو لکھنؤ، علم وفن دہلی، شبستان دہلی، ہما دہلی، شاعر بمبئی۔ علی گڑھ میگزین علی گڑھ، اردو ادب علی گڑھ، نیا دور لکھنؤ، فکر و نظر علی گڑھ، آج کل دہلی، جامعہ دہلی، اعتماد یہ دہلی، جاں نثار امرتسر، سوویت جائزہ دہلی، شگوفہ حیدر آباد قابل ذکر ہیں۔ پاکستان سے صحیفہ لاہور، نقوش لاہور۔ ماہ نو کراچی، اردو کراچی، اوراق لاہور کے غالب نمبروں کا اب تک علم ہو سکا ہے۔

انگلستان، امریکہ، سوویت یونین میں غالب کی یاد میں کئی اہم تقریبیں ہو چکی ہیں امریکہ اور سوویت یونین سے غالب پر مضامین کے مجموعے بھی شائع ہونے والے ہیں۔ غرض غالب پر کام در اصل اب شروع ہوا ہے اور امید ہے کہ اس تحقیقی و تنقیدی سرمائے کی وجہ سے غالب کی زندگی اور ان کے کارنامے دونوں کی صحیح پرکھ ہو سکے گی اور اس سے اُردو زبان و ادب کی مقبولیت میں اضافہ ہو گا اور اس کی ترقی کی راہیں نکلیں گی۔

آل احمد سرور